اس دعوے کے ساتھ کیا تھا کہ وہ یہاں کے باشندوں کو 'تہذیب کا درس دے'۔ اس مقصد کے لیے Civilising Mission اور White-Man's Burden جیسے پُرکشش نعرے وضع کیے گئے اور نصف دنیا کو اپنا محکوم بنا لیا گیا۔ بُرے کاموں کے لیے اچھے ناموں کا استعمال، مذموم مقاصد کے لیے حسین اصطلاحات کی تراش خراش، ظلم و استبداد کے لیے لطیف سے لطیف وجہِ جواز، دوسروں کو غلام بنا کر انھی کے مفاد کے تحفظ کا ڈھونگ رچانا، سامراجی اور استبدادی قوتوں کا شعار رہا ہے۔

آزادی کے نام پر دوسروں کو آزادی سے محروم کرنا، تہذیب و تمدن کے فروغ کے نام پر تہذیب کی تمام اَقدار کو پامال کرنا، تعلیم کے نام پر علم کی شمعیں گُل کرنا، ترقی کے نام پر سرمایۂ حیات کو لوٹ لینا، امن و آشتی کے نام پر قوموں اور ملکوں کو تاراج کرنا، جمہوریت کے فروغ کی خاطر جمہور کا خون چُوس لینا، مضبوط حکومت کی ضرورت کے نام پر انسانی حقوق کو روند ڈالنا ـــــ یہ ہے سامراجی استبداد کی پوری تاریخ اور اس کے اندازِ کار کا خلاصہ۔ ہر ملک میں مغربی سامراج نے یہی کیا، اور برعظیم پاک و ہند کی سرزمین بھی اسی ظلم و فساد، دھوکے اور بے رحمانہ نفاق کی آماج گاہ بنی اور ہر دیکھنے والی آنکھ نے دیکھا کہ:

یہ صحن و روش، یہ لالہ و گُل، ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تعمیر جنوں کے پردے میں، تخریب کے ساماں ہوتے ہیں

استبدادی نفسیات

یہی وہ ذہن ہے جس کی عکاسی مشہور برطانوی ادیب جارج برنارڈ شا [م: ۲ نومبر ۱۹۵۰ء] نے اپنے مشہور ناول The Man of Destiny (۱۸۹۶ء) میں ایک مقام پر اس طرح کی ہے:

> ہر انگریز پیدایشی طور پر خزانۂ اَبد سے دُنیا کا حاکم اور آقا بننے کی معجزانہ قوت لے کر آتا ہے۔ جب وہ کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو کبھی یہ نہیں کہتا کہ میں اس کو چاہتا ہوں، بلکہ وہ خاموشی سے صبر کرتا اور پورے اطمینان کے ساتھ انتظار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں یہ یقین کامل القا ہوتا ہے [یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ نازل کہاں سے ہوتا ہے؟] کہ: 'یہ اس کی اخلاقی اور مذہبی ذمہ داری ہے، اِن لوگوں کو فتح کرے، جن کے پاس وہ شے ہے'۔ یہ احساس شدید تر ہوتا ہے اور بالآخر ناقابلِ ضبط ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے

کہ مفید مطلب اور اخلاقی رویے کے باب میں وہ کبھی کوتاہ دامن نہیں رہتا۔ آزادی اور قومی حُریت کے علَم بردار ہونے کی حیثیت سے وہ آدھی دُنیا کو ہڑپ کر جاتا ہے اور اس کا نام رکھتا ہے 'نئی آبادی'۔ جب اسے اپنی مانچسٹر کی ملاوٹ زدہ مصنوعات کے لیے ایک نئی منڈی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اس سرزمین کے باسیوں کو صحیفۂ امن کے اسرار و رُموز سکھانے کے لیے مشنریوں کو بھیج دیتا ہے۔ وہاں کے باشندے مشنری کو قتل کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً مذہب خطرے میں پڑ جاتا ہے اور عیسائیت کی حفاظت و مدافعت کے لیے فوجیں دوڑ پڑتی ہیں، اُس کی خاطر جنگ ہوتی ہے اور ملک فتح کیا جاتا ہے۔ رہی تجارتی منڈی تو وہ تو عطیۂ خداوندی کی حیثیت سے آپ اس کی جھولی میں آپڑتی ہے۔ [1] پھر مذکورہ بالا 'اعلیٰ مقاصد' ہی کے لیے اس تسلط کو برقرار، مستحکم اور مضبوط کیا جاتا ہے۔ ملک کے اصلی باشندوں کی خیرخواہی میں بیرونی راج کو طویل سے طویل تر کیا جاتا ہے۔ آزادی کی

---

[1] برنارڈ شا نے لکھا:

"Every Englishman is born with a certain miraculous power that makes him master of the world. When he wants a thing, he never tells himself that he wants it. He waits patiently until there comes into his mind, no one knows how, a burning conviction that it is his moral and religious duty to conquer those who have got the thing he wants. Then he becomes irresistible. Like the aristocrat, he does what pleases him and grabs what he wants: like the shopkeeper, he pursues his purpose with the industry and steadfastness that come from strong religious conviction and deep sense of moral responsibility. He is never at a loss for an effective moral attitude. As the great champion of freedom and national independence, he conquers and annexes half the world, and calls it Colonization. When he wants a new market for his adulterated Manchester goods, he sends a missionary to teach the natives the gospel of peace. The natives kill the missionary: he flies to arms in defense of Christianity, fights for it, conquers for it and takes the market as a reward from heaven". (*Democracy and its Rivals by* Christopher Lloyd, Longman, London, 1943, p31).

تحریکوں کو 'بغاوت' کا نام دے کر کچلا جاتا ہے۔ عوام کو سیاسی نابالغی کے نام پر بنیادی حقوق سے محروم کیا جاتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے نام پر ذہنی، فکری اور تمدنی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط تر کیا جاتا ہے، اور اگر مجبور ہو کر کچھ مطالبات ماننے پڑتے ہیں تو اس 'مجبوری' کو انسانیت پرستی، حُریت پسندی، وسعتِ قلبی اور بالغ نظری کے خوب صورت ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ کل کا انگریزی استعمار ہو یا فرانسیسی یا روسی اور اطالوی یا پھر آج کا امریکی استعمار ___ سب کا کردار، مقاصد اور اندازِ کار ایک ہی جیسا ہے۔

استبداد کا دریا ہمیشہ اسی رُخ پر بہتا ہے!

ظلم اور اُس کے ہتھیار

انسان کی فطرت راستی اور نیکی پر قائم ہے۔ ایک ہی قانون ہے جو فرد کی پوری زندگی میں اور کائنات کے سارے نظام میں جاری و ساری ہے۔ ہر وہ راستہ جو اس فطرت کے مطابق ہے، خیر و فلاح کا راستہ ہے۔ اسے اختیار کرنا آسان اور سہل ہے اور اس کے نتائج سب کے لیے نافع اور اطمینان بخش ہیں۔ ظلم، اس فطرت سے انحراف اور اس کے خلاف بغاوت کا نام ہے۔ چونکہ یہ انحراف دل و دماغ اور انسان کی فطری کیفیت اور طبیعت کے خلاف ہے، اس لیے اسے بروے کار لانے کے لیے وہ ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں جو فطرت کو مسخ کریں۔ بنیادی طور پر یہ ذرائع دو قسم کے ہیں: وہ جو دھوکے اور جھوٹ سے عبارت ہیں، اور دوسرے وہ جن کا سرچشمہ جبر اور تشدد ہیں۔

جھوٹ اور دھوکے کے ذرائع سے عقل و ذہن کو غلط راستے پر ڈالا جاتا ہے، قلب و روح کو مسخ کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اختیار و ارادہ دیا ہے، اس کے ناروا، غلط اور ناجائز استعمال کی راہ پیدا کی جاتی ہے۔ اگر جھوٹ اور دھوکے کے حربے کامیاب نہ ہوں تو پھر جبر و تشدد کے ہتھیاروں سے فطرت کو انحراف پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ترغیب و ترہیب، غلط بیانی، جھوٹ، دھوکا، فریب، ظلم و زیادتی، جبر و تشدد اور شقاوت و استبداد ہی وہ ہتھیار ہیں، جو اہلِ باطل نے ہمیشہ، ہر دور میں، اور ہر مقام پر استعمال کیے ہیں۔ یہی کچھ ماضی میں کیا جاتا رہا، یہی حال میں کیا جارہا ہے، اور یہی مستقبل میں کیا جاتا رہے گا۔ انھی ہتھیاروں کو برطانوی سامراج اور اس کی

تہذیبی اور سیاسی ذُریت نے حکومت اور اقتدار کے نشے میں اس برصغیر کے باشندوں کے خلاف استعمال کیا اور یہی ہتھیار آج کی استعماری قوتیں استعمال کر رہی ہیں، خصوصیت سے 'امریکا سب سے پہلے' اور 'دہشت گردی' کو نیست و نابود کرنے کے نام پر مغربی اقوام اور مسلح افواج کی خونیں کارگزاریاں۔

۲

استعمار کے خطرناک کھیل کو سمجھنے کے لیے برطانیہ کی برصغیر پاک و ہند میں سامراجی حکمت عملی کو سمجھنا بہت ضروری اور چشم کشا ہے۔

برطانیہ کے اربابِ اختیار جس طریقے سے اس ملک پر غالب آئے، اس کی داستان بڑی شرم ناک ہے۔ انھیں اس ملک کے باشندوں نے دعوت نہ دی تھی، خود منتخب نہ کیا تھا، بلکہ پسند تک نہ کیا تھا۔ ہاں، البتہ ان سے جو عظیم گناہ سرزد ہوا، وہ یہ تھا کہ سامراجیوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر چند بدیسیوں کو کچھ حقوق اور تحفظات دے دیے تھے ___ اور یہ حقوق اور تحفظات بھی بڑی حد تک تجارت اور تجارتی اثاثے کی حفاظت سے متعلق تھے، مگر وہ ایسا دروازہ بن گئے، جن سے استعماری قوتیں داخل ہوکر دوصدیوں کے لیے قابض حکمران بن گئیں، اور جس ذہنیت کو انھوں نے پروان چڑھایا وہ استعمار کے سیاسی غلبے کے ختم ہوجانے کے باوجود ذہنی اور تہذیبی غلامی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ آج 'گلوبلائزیشن' (عالم گیریت) اور 'معاشی امداد' کے حسین ناموں سے یہی کھیل کھیلا جارہا ہے۔

عیارانہ چالوں سے آمد

بس یہی وہ چیز تھی، جس نے ہمارے دروازوں کو غیروں کے لیے کھول دیا۔ ان کی تجارتی کوٹھیوں [یعنی سامراجی تجارتی کمپنیوں] کا اثر ونفوذ بڑھنا شروع ہوا، اور سیاسی چالوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اہلِ ملک کے ایک طبقے کو دوسرے کے خلاف صف آرا کیا جانے لگا۔ غداروں کو چھانٹ چھانٹ کر بلند مناصب پر بٹھایا گیا۔ مقامی افواج میں بغاوت اور بے وفائی کی سرنگیں لگائی گئیں۔ یہ کھیل تقریباً دوسو سال تک کھیلا گیا اور بالآخر لومڑی کی یہ عیّارانہ چالیں شیر کو چاروں شانے چِت گرانے میں کامیاب ہوگئیں۔

ظلم اور تشدد

اربابِ ظلم کی ہمیشہ سے یہ روش رہی ہے کہ وہ فوج کے غلط استعمال اور بالواسطہ قسم کے ہتھکنڈوں کے استعمال سے اپنے اقتدار کا تخت بچھاتے ہیں۔ بہادر انسانوں کی طرح میدان میں مقابلہ کرنے کے بجاے محلاتی سازشوں کے ذریعے اپنا تسلط قائم کرتے ہیں۔

اقتدار پر متمکن ہوجانے کے بعد سامراجی حکمرانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنے اہم ترین مخالف کی کمر توڑنا تھا۔ ظاہر ہے یہ مخالف مسلمان تھا، جو اس ملک پر تقریباً آٹھ سو سال سے حکمران تھا اور جو غلامی کے ساتھ خود کو سازگار بنانے کے لیے کسی قیمت پر تیار نظر نہ آتا تھا۔ رہ رہ کر بغاوت اور مہم جوئی کے ذریعے کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس قسم کی تمام کوششوں کو جبر وقوت اور چالاکی اور عیاری کے ذریعے کچلا گیا۔ سیّد احمد شہید [م: ۶ مئی ۱۸۳۱ء] کی سربراہی میں 'تحریکِ مجاہدین'، حاجی شریعت اللہ [م: ۱۸۴۰ء] کی قیادت میں 'فرائضی تحریک'، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، خیبر پختونخوا میں ۱۸۶۳ء میں امبیلا کی سرفروشانہ جنگیں، موپلوں کی بغاوت اور بے شمار مقامی نوعیت کی لہو گرمانے والی لڑائیاں اس جدوجہد کا عنوان ہیں۔ ان سب کو قوت وتشدد کے ساتھ کچل کر مسلمانوں کی کمر توڑ دی گئی۔ آزادی وحُریت کی شاہراہ پر گام زن لاکھوں جاں بازوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ ان کے پورے کے پورے خاندانوں کو تہِ تیغ کیا گیا۔ پورے ملک پر خوف اور دہشت کی ایک فضا قائم کرنے کے بعد، اس زخم خوردہ شیر کے دست و بازو بھی کاٹ دیے، تاکہ اسے مقابلے کے لائق ہی نہ چھوڑا جائے۔

یہ بھی اربابِ ظلم کا دائمی طریقہ ہے کہ وہ فتح وکامیابی اور استحکامِ اقتدار کے بعد شریف انسانوں اور جواں مردوں کی طرح مخالفین کے ساتھ عزت اور احسان کا رویہ اختیار نہیں کرتے بلکہ اُن کے نام ونشان کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، اور جہاں کہیں اختلاف کی بُو بھی سونگھ لیتے ہیں وہاں تشدد کی انتہا کر دیتے ہیں۔

پیٹ کی مار

سامراجی قوتیں صرف اسی پر رضامند نہ ہوئیں بلکہ اپنے اس اہم حریف کو اجتماعی زندگی

کے تمام شعبوں سے بے دخل کرنے اور اُس کی آنے والی نسلوں کو بے حیثیت اور غیر مؤثر کر دینے پر تُل گئیں۔ اُن تمام صنعتوں کو تباہ کیا گیا، جن کے ذریعے قوم کو معاشی استحکام حاصل تھا۔ ماہرین فن اور کاری گروں کے ہاتھ تک کاٹ دیے گئے۔ زرعی نظام کی قلبِ ماہیت کی گئی اور اپنے اقتدار کو محفوظ کرنے کے لیے زمین داری کا دوامی [یعنی مستقل] نظام قائم کیا۔ اس طرح جاگیرداری نظام کو قائم کیا گیا، جو برطانوی راج کا ستون بن گیا۔

پھر مسلمانوں کو معاشی، سیاسی، عدالتی، انتظامی، غرض زندگی کے ہر شعبے سے بے دخل کیا گیا۔ ان پر ملازمتوں کے دروازے بند کیے گئے۔ تجارت وصنعت کو تباہ کیا گیا، جو افراد پہلے سے اجتماعی زندگی میں ایک مقام رکھتے تھے، ان کو آہستہ آہستہ مٹا دیا گیا۔ مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم اقوام کو شہ دی گئی۔ آخرکار یہ حالت ہوگئی کہ ملک کی سرکاری مشینری میں مسلمانوں کا تناسب ۵، ۶ فی صد سے بھی کم رہ گیا اور وہاں بھی جو آسامیاں ان کے پاس تھیں، وہ اعلیٰ انتظامی عہدے نہیں تھے بلکہ وہ صرف کلرک، محرر، چپراسی اور خاکروب بن کر رہ گئے۔ [1]

گویا اس شکست کھائے ہوئے شیر کو صرف پنجرے میں بند ہی نہیں کیا، بلکہ اس کو پیٹ کی مار بھی دی گئی، تاکہ اس کے قویٰ دوبارہ مجتمع ہی نہ ہوسکیں۔ ظالم حکمرانوں کا یہ بھی طریقہ ہے کہ وہ سیاسی لڑائی کے لیے معاشی میدان میں بھی دندناتے ہوئے اُترتے ہیں اور اپنے مخالفین کے لیے نہ صرف معاش کے دروازے بند کرتے ہیں بلکہ تجارت، صنعت، ملازمت، غرض ہر شعبے سے ان کو چُن چُن کر نکال باہر پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دین سے محبت نکال دو

بات یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس ملک کے اصل مالکوں کے ذہن سے آزادی اور خودمختاری کے احساس ہی کو مٹانے کے لیے تعلیم وتربیت اور پروپیگنڈے اور نشرواشاعت کا ایک ہمہ گیر پروگرام اختیار کیا گیا۔ جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ فرد جو غلامی کو قبول نہیں کر رہا ہے،

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ● The Indian Mussalmans ● The Report of the Committee of the Central National Mohammadens Association 1885-89. ● رام گوپال: Indian Muslims, A Political History.

اسے زیر کرنے کے لیے اس کے ذہن کو غلام بنالیا جائے، جو اُس کے جسم پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس طرح نئی نسلوں کے فکرونظر کو بدل دیا جائے، تاکہ 'باغیوں' کی اولاد کو 'غلامی کے اسرار' سکھائے جاسکیں اور اُس سرچشمے کو گدلا کر دیا جائے، جس سے زندگی اور غیرت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے تعلیم کے نظام کو بدلا گیا اور اس نئے 'تیزاب' میں مسلمان کی 'خودی' کو ڈال کر ایسا ملائم بنادیا گیا کہ اسے جدھر چاہیں موڑ لیں۔ یہ تھی وہ تدبیر جس سے 'سونے کا ہمالہ' مٹی کا ایک ڈھیر بن گیا۔ اقبال نے اس چال کو ان الفاظ میں فاش کیا ہے:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ہوجائے ملائم تو جدھر چاہے، اسے پھیر
تاثیر میں اِکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب سونے کا ہمالہ ہو تو مٹّی کا ہے اک ڈھیر

پھر معاشرت، سماجی طور طریقے، تمدنی ادارے، غرض پوری ثقافت کو بدلنے کی کوشش کی گئی اور دینی برتری، تمدنی روایات اور عسکری روح کی جگہ آدابِ غلامی میں طاق کرنے کی کوشش کی گئی کہ:

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صُورت گری و علمِ نباتات

اصول پرستی کی جگہ موقع پرستی اور عسکریت کی جگہ بزدلی اور 'آرٹ پرستی' پیدا کی گئی۔ خارہ شگافی کی جگہ 'فنِ شیشہ گری' سکھایا گیا اور پروپیگنڈے اور نشرواشاعت کے سارے دروازے اس مقصد کے لیے استعمال کیے گئے کہ:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
رُوحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

غرض غلامی کی نفسیات کو اس کی رگ و پے میں سرایت کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی:

بہتر ہے کہ شیروں کو سِکھا دیں رمِ آہُو باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

یعنی یہ شیر، شیر ہی نہ رہے بلکہ اس میں بکری کا ذہن پیدا ہوجائے اور یہ اُسی کی طرح ممیانے لگے۔ ظالم حکمرانوں کی یہ بھی روش ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو اپنے خیال میں مستقل اور دائمی کرنے کے لیے قوم کے 'نفسیاتی قتل' کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں سے بہادری، شجاعت،

اصول پرستی، عزت نفس، خودداری، حق پسندی، جفاکشی اور جذبۂ جہاد کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے غلط تعلیم اور اخلاق باختہ ثقافت کے ذریعے لذت پرستی، مفاد پرستی، بزدلی اور خوشامد کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ امراض پوری قوم کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں اور سیرت کی وہ بنیادیں ہی ختم ہوجاتی ہیں، جن سے قوم میں وہ افراد پیدا ہوسکیں جو بلند کردار، وفاشعار، اصولوں کے پرستار اور حق کے فداکار ہوں اور جو ان کے ظالمانہ اقتدار کے لیے خطرہ ثابت ہوسکیں۔

من پسند تاویلیں

پھر چوں کہ سامراجی حکمران یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ مسلمانوں کی قوت کا اصل سرچشمہ ان کا دین اور اس دین سے والہانہ وابستگی ہے، اس لیے ایک طرف ان کو اس سرچشمے سے کاٹنے کی کوشش کی، تو دوسری طرف یہ انتظام کیا کہ جس سے ایسے لوگ اُبھریں، جو قرآن وسنت کی تعلیمات کو مدافعت پسندوں (Apologists) کی معذرت خواہانہ تاویلات کے پھندے میں جکڑنے کی کوششیں کریں۔ تیسری جانب اسلام کے احکامات کو متجدّدین (Revisionists) کے ہاتھوں مسخ کرکے حکمرانوں کے لیے مفید مطلب بنادیں، جہاد کو منسوخ بتائیں اور سود کے جواز کا فتویٰ دیں۔ ناچ رنگ، مصوری اور مجسمہ سازی کی گنجایش پیدا کریں اور سب سے بڑھ کر اُمت کی بنیادوں ہی کو منہدم کرڈالیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر ایک 'جعلی نبوت' کا بُت تراشیں ___ اور جو اس مذہبی 'جعل سازی' کی مخالفت کرے اسے تنگ نظر، دقیانوس، مذہبی جنونی اور کٹھ مُلّا قرار دے کر نکّو بنادیں۔

اس طرح 'دینِ شیری' محض ایک 'فلسفۂ روباہی' بن کر فرعونی قوت کا مرید ہوجائے:

دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ رُوباہی
ہو اگر قُوّتِ فرعون کی درپردہ مُرید قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

اہلِ ظلم کا یہ بھی ایک مخصوص حربہ ہے کہ وہ اپنے سیاسی مفاد کی خاطر محکوم قوم کے دین تک کو بچوں کا کھیل بنادیتے ہیں اور سرکاری خزانے اور اثر ورسوخ کو استعمال کرکے احکامِ دین کو مسخ کراتے ہیں، من مانی تاویلات کراتے ہیں، اور اہلِ مذہب میں سے مفاد پرستوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ وہ ان کے ہر غلط اقدام کے لیے دین کی 'سند' گھڑ کر پیش کریں۔

موقع پرستوں کی قیادت

ملک کی قیادت میں انتشار پیدا کرنے اور میدان کو اپنے لیے ہموار کرنے کے لیے برطانوی سامراج نے ایک طرف قوم کے جوہرِ قابل کو چُن چُن کر قتل کیا، جلاوطن کیا، یا جیلوں میں ڈال دیا۔ دوسری طرف اہلِ وطن ہی میں سے اُن عناصر کو، جو ذاتی مفاد کی خاطر سب کچھ، حتیٰ کہ اصولِ دین اور قوم کا مفاد تک قربان کرنے کو تیار ہوتے گئے، چھانٹ چھانٹ کر اُوپر لانا شروع کیا۔ زمین داروں اور جاگیرداروں کی کھیپ تیار کی گئی۔ خان بہادروں اور خاں صاحبوں کی ایک فوجِ ظفر موج میدان میں اُتاری گئی۔ وہ جنھوں نے اپنا 'سر' برطانوی سامراج کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا، ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب پر لایا گیا، تاکہ اصول کے لیے جان کی بازی لگا دینے والوں کی جگہ ملک کی قیادت ایسے بے ضمیر موقع پرستوں کے ہاتھوں میں آجائے:

ترے بلند مناصب کی خیر ہو، یاربّ! کہ ان کے واسطے تُو نے کیا خودی کو ہلاک
شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے خریدتے ہیں فقط اُن کا جوہر اِدراک!

نااہل موقع پرستوں کو قیادت کے مناصب پر فائز کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد خوشامدیوں کا ایک لشکر جمع کر لیتے ہیں۔ وہ گاڑی جو صلاحیت اور تدبیر سے نہیں چلائی جاتی اسے خوشامدی اور حاشیہ نشین کھینچ کھینچ کر آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح قوم کا مزاج بگاڑ کی انتہائی پستیوں کو چھونے لگتا ہے:

کر تُو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد دستور نیا ، اور نئے دَور کا آغاز
معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت کہہ دے کوئی اُلّو کو اگر 'رات کا شہباز!'

اور یہ سب کچھ اس لیے کہ شیر کی ہر خو بو کو ختم کر کے اُسے لومڑی کے دربار کا دربان بنا دیا جائے۔ یہ بھی ظالم حکمرانوں کی فطرت ہے کہ وہ جوہرِ خالص کو تو نشانۂ ستم بناتے ہیں اور مفاد پرستوں اور خوشامدیوں کو اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں۔ انھیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے آلۂ کار بناتے ہیں اور یہ زر پرست و زردار ہر بُرے سے بُرے مقصد کے لیے بھی آلۂ کار بننے میں فخر ہی محسوس کرتے ہیں۔

۳

برطانوی سامراج نے اپنے اقتدار کو برصغیر میں قائم کرنے اور مستحکم کرنے کے لیے یہ طریقِ کار اختیار کیا۔ جھوٹ اور دھوکا، ترغیب اور پروپیگنڈے کا ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ جب اور جہاں یہ ہتھیار غیرمؤثر ثابت ہوئے، وہاں جبر و تشدد اور استبداد کے تمام ہتھکنڈے بے دریغ استعمال کیے گئے۔ عیاری اور ظلم کے باوجود جب آزادی اور حقوق کی تحریک نے قوت پکڑی اور وہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی، تو برصغیر کی سیاسی تاریخ کے ابواب، سامراج کی تلوار اور اہلِ وطن کے خون سے لکھے گئے۔

انتظامیہ کے غیر محدود اختیارات

انگریز سامراج نے سول انتظامیہ کو غیرمعمولی اختیارات سے مسلح کیا اور اس سلسلے میں متعدد قوانین بغاوت (Sedition Laws) منظور کیے، جن کی وجہ سے جلسے اور جلوس ممنوع کیے گئے۔ تقریر و تحریر پر نئی نئی پابندیاں لگائی گئیں، انتظامیہ اور پولیس کو یہ اختیارات دیے گئے کہ وہ شبہے کی بنا پر گرفتاریاں کر سکتے ہیں۔ مجسٹریٹوں کو بغیر مقدمہ چلائے اور بغیر صفائی کا موقع دیے، املاک ضبط کرنے کے اختیارات تفویض کر دیے گئے، اور جب اس پر بھی دل خوش نہ ہوا تو ۱۹۰۸ء کا 'کرمنل امینڈمنٹ ایکٹ' لایا گیا، جس کے ذریعے جس تنظیم کو چاہیں غیرقانونی قرار دیں اور جب تک چاہیں پابند رکھیں۔ جس شخص کو چاہیں، غیرقانونی سرگرمیوں کے عنوان سے گرفتار کرلیں۔ جن املاک کو چاہیں، حکومت کے قبضے میں لے لیں۔ نیز دفعہ ۱۲۴-الف کا اضافہ کیا گیا جس کی رُو سے عملاً حکومت پر ہر تنقید 'بغاوت' (sedition) کے معنی میں داخل کر دی گئی۔

اخبارات کی زباں بند

بہ جبر اخبارات کی زباں بندی اور ان پر دہشت کی فضا مسلط کرنے کے لیے فوج داری قانون کے تحت بیوروکریسی، پولیس اور مجسٹریٹوں کو اخبارات کو بند کرنے، اخبار نویسوں کو گرفتار کرنے، سیکورٹی طلب کرنے اور املاک ضبط کرنے کے اختیارات دیے گئے۔ جو کسر رہ گئی وہ ۸ جون کو Newspaper (Incitement to offences) Act 1908 کے نفاذ نے پوری کر دی۔ جس کی

رُو سے مجسٹریٹوں کو مقدمے کی سماعت سے قبل ہی پریس ضبط کرنے کا حق دیا گیا اور جس کے تحت ۱۴ سال اور ۲۰ سال تک کی قید رکھی گئی۔ پھر فروری ۱۹۱۹ء میں 'رولٹ ایکٹ'[1] پاس کیا گیا، جس نے صحافت کو اُلٹی چھری سے ذبح کر دیا اور جس کے خلاف بے مثال ملک گیر احتجاج ہوا۔

ان قوانین کو استعمال کر کے ہزاروں افراد پر مقدمے چلائے گئے اور بلاشبہہ لاکھوں افراد کو جیلوں میں ٹھونسا گیا۔ ایک ایک شہر کی جیلوں میں تین تین اور چار چار ہزار آدمی بند کیے گئے۔ گرفتاریاں اس پیمانے پر ہوئیں کہ جیل کی عمارتیں ناکافی ثابت ہوئیں اور خیمے لگا کر اور فوجی کیمپ قائم کر کے آزادی کے سپاہیوں کو محبوس کیا گیا۔[2]

قتل کے کیا کیا سامان؟

اخبارات کو بند کرنے اور ان سے ضمانتیں طلب کرنے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا اور بلاشبہہ سامراج نے آخری ۵۰ برسوں میں سیکڑوں اخبارات اور رسائل کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ اندازہ اس بات سے کیجیے کہ:

- صرف ایک سال میں، یعنی ۱۹۳۴ء میں، صرف ایک صوبہ، یعنی بنگال میں دو ہزار ایک سو نظر بند (detenus) تھے۔[3] یعنی وہ جو مقدمہ چلائے بغیر جیل کے باڑے میں بند کر دیے گئے تھے۔ جن پر بغاوت اور قانون شکنی (بسلسلہ سول نافرمانی) وغیرہ کے مقدمات چلے تھے، وہ الگ رہے۔ تشدد اور عدم رواداری کی انتہا یہ ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور

---

[1] برطانوی حکومت نے مقبوضہ ہندستان کے خاص طور پر دو علاقوں بنگال اور پنجاب میں حُریت کی تحریکوں کو کچلنے کی حکمت سازی کے لیے یہ نظریہ پیش کیا کہ: 'یہاں پر تمام بے چینی کے پیچھے جرمنی اور اشتراکی روس کے رابطے کارفرما ہیں'۔ اس مفروضے کو ثابت کرنے اور اس کا جواب تجویز کرنے کے لیے ۱۹۱۷ء میں جسٹس سڈنی آرتھر رولٹ [۱۸۶۲ء-۱۹۴۵ء] کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ فروری ۱۹۱۹ء میں اس کمیٹی کی سفارشات Rowlatt Act کے نام سے منظور اور ۱۸ مارچ کو نافذ کر دی گئیں۔

[2] پنڈت جواہر لعل نہرو [م: مئی ۱۹۶۴ء] نے اپنی کتاب *The Discovery of India* اور چودھری خلیق الزماں [۱۸۸۹ء- ۱۹۷۳ء] نے اپنی خودنوشت شاہراہِ پاکستان میں ان کی تفصیل دی ہے۔ پنڈت نہرو کے اندازے کے مطابق ایک ایک شہر سے تیس، چالیس ہزار آدمیوں کو گرفتار کیا گیا۔

[3] بحوالہ بیان سر ہنری ہیگ، وزیر داخلہ اور مجلسِ قانون ساز، ۲۳ جولائی ۱۹۳۴ء

[۱۸۶۱ء-۱۹۴۱ء] جیسے شخص کو، ایک غیر سیاسی مضمون پر وارننگ دی گئی اور جس رسالے نے اُن کا وہ مضمون شائع کیا تھا، اُس کے خلاف فوج داری بنیاد پر کارروائی کی گئی۔

- صرف پانچ سال، یعنی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک صرف مرکزی حکومت نے ۵۱۴ اخبارات (رسائل وغیرہ کو چھوڑیئے) سے ضمانتیں طلب کیں، ۳۴۸ کی اشاعت بند ہوئی اور بطور زرِضمانت کے ۲ لاکھ ۵۲ ہزار ۸ سو ۵۲ روپے حکومت نے وصول کیے۔ [۱]
- 'کرمنل امینڈمنٹ ایکٹ' کا بڑے پیمانے پر استعمال ہوا اور صرف ۱۹۳۲ء میں کئی سو تنظیموں کو اس کے تحت غیر قانونی قرار دیا گیا۔ کانگریس کے ساتھ جن اداروں کو خلافِ قانون قرار دیا گیا اُن کی فہرست کئی صفحات پر پھیلی ہوئی تھی اور ان کی تعداد کئی سو سے تجاوز تھی۔ [۲]

یہ صرف چند برسوں کی داستان ہے۔ اسی پر پورے دورِ استبداد کا اندازہ کر لیجیے:

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

آرڈی ننس کا راج

قانون ساز اداروں میں سامراجی حکمرانوں کو قابلِ اعتماد اکثریت حاصل تھی اور اپنے من مانے قوانین بلادقّت منظور کرا سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود پورے ملک پر آرڈی ننسوں کا راج تھا۔ زندگی کے ہر شعبے کو آرڈی ننسوں کے ذریعے جکڑ دیا گیا تھا اور اسمبلیوں کی حیثیت محض ربڑ کی مہر کی ہوگئی تھی۔ سر سیموئیل ہور سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے ہند نے برطانوی پارلیمنٹ میں کہا کہ: ''میں اعتراف کرتا ہوں کہ جو آرڈی ننس ہم نے نافذ کیے ہیں، وہ نہایت سخت اور انتہا درجے کے جابرانہ ہیں۔ یہ آرڈی ننس اہلِ ہند کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر حاوی ہیں''۔ [۳]

چودھری خلیق الزماں آرڈی ننسوں کے اس حربے کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ: ''گاندھی جی [۱۸۶۹ء-۱۹۴۸ء] کی گرفتاری کے بعد وائسرائے نے ایک آرڈی ننس نکال کر،

---

[۱] بحوالہ مرکزی قانون ساز اسمبلی، سرکاری بیان، ۴ ستمبر ۱۹۳۵ء

[۲] پنڈت نہرو، The Discovery of India، ص ۳۲۳

[۳] بیان بتاریخ ۲۴ مارچ ۱۹۳۲ء

کانگریس کے تمام دفتروں کو ناجائز قرار دے دیا اور انھیں بند کرا دیا۔ سول نافرمانی کرنے والوں کو اب صرف جیل کی سزا ہی نہیں دی جاتی تھی، بلکہ ان کی جایداد بھی ضبط کر لی جاتی..... وائسرائے کا یہ نیا نسخہ بہت کڑوا تھا"۔ [1]

خون کی ہولی

بے رحم ظالموں نے اس ملک میں کیا کچھ کیا، اس کا اندازہ اُن سیکڑوں واقعات سے ہوسکتا ہے، جن میں انسانوں کے خون سے بے رحمی کے ساتھ ہولی کھیلی گئی۔ ایسے ہی واقعات میں سے ایک جلیانوالہ باغ کا واقعہ [۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء] ہے۔

فروری ۱۹۱۹ء میں منظور شدہ 'رولٹ ایکٹ' ۱۸ مارچ کو نافذ کر دیا گیا۔ جس پر ملک بھر میں احتجاج شروع ہوگیا۔ تحریکِ خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک، دونوں کا اثر پورے ملک میں اپنے شباب پر تھا۔ اُسی دور کے اُبھرتے ہوئے مسلمان لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو [۱۵ جنوری ۱۸۸۸ء- ۹/اکتوبر ۱۹۶۳ء] نے امرتسر میں جلسے کا اعلان کیا، لیکن انھیں جلسے کے منعقد ہونے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ احتجاجی جلوس نکلا تو پولیس نے دخل اندازی کر کے بات پتھراؤ، لاٹھی چارج اور گولیوں تک پہنچا دی۔ اہلِ ہند تو خدا جانے کتنے رزقِ خاک بن گئے اور جوابی طور پر پانچ انگریز بھی اس میں کام آئے۔

پھر کیا تھا، شہر کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا اور فوج کرنل ڈائر [2] کی قیادت میں نہتے شہریوں کے خلاف صف آرا ہوگئی۔ جلیانوالہ باغ میں احتجاجی جلسہ ہو رہا تھا۔ باغ چاروں طرف سے

---

[1] چودھری خلیق الزمان، شاہراہِ پاکستان، ناشر: انجمن اسلامیہ پاکستان، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۵۲۷

[2] کرنل ریجنالڈ ہیری ڈائر (۱۸۶۴ء، مری- جولائی ۱۹۲۷ء سمرسٹ) یہ گورا مری میں 'مری بریوری' شراب کشید کرنے والی کمپنی کے مینیجر کے ہاں پیدا ہوا۔ برطانوی فوج میں بطور افسر شامل ہوا، جسے عارضی طور پر بریگیڈیئر جنرل بنایا گیا تھا، جلیانوالہ باغ، امرتسر میں قتل عام کا ذمہ دار تھا، مگر تاجِ برطانیہ کی نگاہ میں ایک ہیرو تھا۔ اہلِ نظر کی رائے ہے: 'ڈائر کے ظلم نے ہند میں برطانوی راج کے خاتمے کا آغاز کیا'۔ تاہم، کلکتہ میں پیدا ہونے والے دوسرے انگریز زادے اور مشہور ادیب ورڈیارڈ کپلنگ (دسمبر ۱۸۶۵ء- جنوری ۱۹۳۶ء) نے ڈائر کی امداد کے لیے ۲۶ ہزار پونڈ کا اعانتی فنڈ بھی قائم کیا۔ کپلنگ پہلا برطانوی تھا جسے ۱۹۰۷ء میں 'نوبیل پرائز' ملا۔

بند تھا، صرف ایک دروازہ کھلا تھا اور اس سے کرنل ڈائر رائفلوں سے مسلح سپاہیوں کے ساتھ دندناتا ہوا داخل ہوا۔ وارننگ کے نتائج واثرات کا بھی انتظار نہ کیا اور اندھادھند فائرنگ شروع کر دی گئی۔ اُس کے اپنے اعتراف کے مطابق ۱۶۹۹ گولیاں چلائی گئیں اور فائرنگ اس وقت بند کی گئی جب اسلحہ ختم ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ۴۰۰ لاشیں تڑپنے لگیں اور ہزار سے زیادہ افراد زخمی ہوئے۔ شاید کرنل ڈائر کی ایک بھی گولی خالی نہ گئی۔

بات جلسے تک نہ رہی، پورے شہر کو ظلم و استبداد اور وحشت و درندگی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لوگوں کا گھروں سے نکلنا دوبھر ہوگیا۔ ایک پوری بارات کو جس میں دولہا بھی شامل تھا، بلاوجہ پکڑ کر کوڑوں سے پٹوا ڈالا گیا۔ ریل گاڑی میں ہندستانی باشندوں کے سفر کی ممانعت کر دی گئی۔ عورتوں کی کھلے منہ بے حُرمتی کی گئی۔ امرتسر میں ایک گلی مقرر کی گئی، جس میں سے ہر شخص کو پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گزرنا پڑتا تھا۔ جس شخص کو جو گورا نظر آئے، لازم کیا گیا کہ اس کو سلام کرے، ورنہ کوڑے مارے جائیں گے۔ فوج کی طرف سے جو اشتہار لگائے گئے اُن کی حفاظت انھی اہلِ خانہ کے سپرد کی گئی، جن کے گھر کی چہاردیواری پر انھیں آویزاں کیا گیا تھا۔ اشتہار پھٹنے کی صورت میں اہلِ خانہ کے لیے سزا مقرر کی گئی۔ سر فضل حسین [۱۸۷۷ء-۱۹۳۶ء]، خلیفہ شجاع الدین [۱۸۸۷ء-۱۹۵۵ء] اور پیر تاج الدین [۱۸۷۸ء-۱۹۵۴ء] جیسے معززین کے مکانوں پر بھی اس قسم کے اشتہار چسپاں کیے جاتے تھے اور انھیں تمام دن مکان سے باہر کھڑے رہنے کی ذلّت برداشت کرنا پڑتی تھی۔ [۱]

اس سب پر مستزاد، فوجی عدالتیں تھیں، جنھوں نے پلک جھپکتے ہی ۲۹۸ مقدمات کا فیصلہ سنا دیا۔ ۵۱ کو سزاے موت، ۴۶ کو عمر قید، دو کو ۱۰ سال کی قید، ۶۹ کو سات سال کی، ۱۰ کو پانچ سال کی قید بامشقت اور ۱۳۰ کو تین برس سزا دی گئی۔ [۲] پھر 'عدالت' کا جو ڈھونگ رچایا گیا، اس میں یہ جدت بھی کی گئی کہ ملزموں کو وکیل کے ذریعے اپنے دفاع کا حق نہ تھا۔ [۳]

---

[۱] عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے آخری دو سال، مطبوعہ اقبال اکیڈمی، کراچی، ص ۱۰۲-۱۰۳

[۲] چودھری خلیق الزماں، شاہراہِ پاکستان، ص ۳۳۹

[۳] اقبال کے آخری دو سال، ص ۱۰۴

جباروں کی یہ فطرت رہی ہے کہ وہ عدالت کے ذریعے بھی انصاف کے دروازے بند کیا کرتے ہیں۔ انصاف سے ان کی ازلی دشمنی ہوتی ہے! اور یہ بھی ایک دل خراش حقیقت ہے کہ بقول چودھری خلیق الزماں، جلیانوالہ باغ، امرتسر پر حملہ آور جنرل ڈائر کی یہ 'فوج' ۵۰ر انگریز سپاہیوں اور ۱۰۰ ہندستانی جوانوں پر مشتمل تھی۔ [1]

ظالم ظلم کے لیے بھی مظلوموں ہی کے اپنوں میں سے کچھ کو استعمال کرتے ہیں اور ان کو ایسی ذلّت آمیز مدد کرنے والے مل ہی جاتے ہیں۔ اہلِ ہند کے خون سے یہ ہولی صرف امرتسر میں نہیں، پورے ملک میں کھیلی گئی۔ ہم نے صرف ایک واقعے کا تذکرہ کیا ہے۔ ورنہ یہی خونیں کہانی، مسجد شہید گنج، مسجد کانپور، قصہ خوانی بازار، موپلوں کی پوری پوری بستیوں اور بیسیوں جگہ دُہرائی گئی۔

ظالمانہ اقتدار کی 'برکتیں'

پنجاب میں اس خونیں ڈرامے کے علاوہ جو مظالم ہو رہے تھے، ان کے بارے میں نیشنل کانگریس کی ایک کمیٹی نے مفصل رپورٹ تیار کی تھی، جس کا ایک اقتباس یہاں دیا جاتا ہے:

> اوڈوائر [2] نے قانون تحفظ ہند سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر حد درجہ معمولی اور پیش پا افتادہ عُذر تراش کر کے سیکڑوں آدمیوں کو جیل میں بند کر دیا۔ اُردو اخبارات کا گلا گھونٹ دینے میں کوئی کسر باقی نہ رہی اور بیرونِ پنجاب چھپنے والے قومی اخبارات کی پنجاب میں آمد روک دی گئی۔ حد یہ ہے کہ اُردو کے وہ اخبار جو چھپنے سے پہلے حکومت کے ہاتھوں

---

[1] چودھری خلیق الزماں، Pathway to Pakistan، لانگ مینز گرین اینڈ کمپنی، پاکستان برانچ، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۴۵

[2] یہاں ضمناً یہ بات واضح کی جاتی ہے کہ جلیانوالہ باغ میں فوج کی قیادت جنرل ڈائر نے کی تھی، جب کہ اسی زمانے میں پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر [۱۸۶۴ء-۱۹۴۰ء] تھا۔ یہ ظالم ترین گورنر مئی ۱۹۱۳ء سے مئی ۱۹۱۹ء تک پنجاب کا حکمران رہا۔ پنجاب میں مظالم کے خلاف مقدمات میں برطانوی عدالت نے اسے بری کر دیا۔ ازاں بعد کیکسٹن ہال، لندن میں ایک تقریب میں وہ شریک تھا تو ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے روز ادھم سنگھ [پ: دسمبر ۱۸۹۹ء] کے ہاتھوں بھرے ہال میں گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ ادھم سنگھ نے اوڈوائر کو قتل کرنے کے بعد اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نے اس کے مظالم کا بدلہ لیا ہے''۔ ادھم سنگھ کو ۳۱ جولائی ۱۹۴۰ء کے روز پھانسی دے دی گئی۔

باقاعدہ سنسر کیے جاتے تھے، اُن کی اشاعت بھی بند کردی گئی۔ اب پنجاب میں نہ تقریر کی آزادی باقی تھی اور نہ تحریر کی آزادی کا وجود تھا۔ اس قسم کا سکوتِ مرگ طاری کرکے اور اس طرح لوگوں کے قلم اور زبان پر پہرے بٹھا دینے کے بعد اوڈوائر نے گویا یہ سمجھ لیا تھا کہ پنجاب کے باشندے اس کے زیرسایہ بالکل مطمئن اور خوش حال زندگی بسر کررہے ہیں۔ [1]

یہ تھا وہ سلوک جو اس ملک کے باشندوں کے ساتھ سامراجی حکمران کررہے تھے۔ ظلم کا یہ خونیں ڈراما پورے ملک میں کھیلا جارہا تھا۔ غم کسی ایک غنچے کا نہیں، رونا پورے گلستان کا تھا۔ ظلم واستبداد کی آکاس بیل پورے چمنِ ہند پر چھا گئی تھی اور اہلِ نظر خون کے آنسو رو رہے تھے۔

۴

ظلم واستبداد کی یہ خوں چکاں داستان بڑی دل خراش بھی ہے اور نہایت عبرت انگیز بھی۔ لیکن اس کا ایک پہلو اتنا شرم ناک ہے کہ شیطان بھی اس پر عش عش کر اُٹھا ہوگا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ استبداد اور ظلم تاویلات کے ریشمی لبادے اُوڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظالم ہمیشہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں: جو کچھ ہم کررہے ہیں، وہ عوام ہی کے فائدے اور بھلائی کی خاطر کررہے ہیں۔ جو طریقِ حکمرانی انھوں نے اختیار کیا ہے وہ ملک کے حالات اور لوگوں کے مزاج کے بالکل مطابق ہے۔ صرف انھی کا بنایا ہوا نظام حقائق سے مطابقت رکھتا ہے اور جو کوئی ان کے ظلم وزیادتی کے خلاف آواز اُٹھاتا ہے یا ان کے طریقے سے اختلاف کرتا ہے، وہ شرپسند، فسادی، ملک دشمن اور سولی چڑھا دینے کے لائق ہے۔ آزادیوں پر پابندی بے حد ضروری ہے۔ جمہوریت کے لیے فضا سازگار نہیں ہے، حقوق کی بحث محض مفاد پرستوں کی اُٹھائی ہوئی ہے۔ انتخابات اور عوام کے حق رائے دہی کے مطالبے محض سیاسی ڈھکوسلے ہیں۔ نمایندہ اداروں میں عوام کے منتخب اور معتمدعلیہ لوگوں کو لیے جانے کے مطالبے محض خودغرضی پر مبنی ہیں اور سیاسی انتشار پیدا کرنے کے لیے ہیں اور ان سب باتوں کا مقصد حکومت کے وقار اور

---

[1] اقبال کے آخری دو سال، ص۴۹-۵۰

حقِ حکمرانی کو مجروح کرنا ہے۔ اصل مسئلہ نہ آزادی سے متعلق ہے اور نہ حقوق، نمایندگی، انتخابات یا جمہوریت سے کچھ تعلق رکھتا ہے۔ اصل ضرورت تو بس مضبوط حکومت اور معاشی ترقی اور خوش حالی کی ہے، اور ساری سیاسی فتنہ انگیزی صرف اس لیے ہے کہ توجہ ان اصل اُمور سے ہٹ کر آزادی اور سیاسی حقوق جیسے لایعنی نعروں پہ لگ جائے اور انتشار رُونما ہو!

ظالم اپنے ظلم کے لیے ایسی ہی تاویلیں تراشتے ہیں، جن کی بنیاد پر ان کا اقتدار استبداد پر قائم ہو۔ اپنی ہر زیادتی کے لیے وہ ایسے ہی جواز پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کو خوش نما بنا کر پیش کرنے ہی کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسروں کی نیتوں پر بے دریغ حملے کرتے ہیں اور آزادی، جمہوریت اور عوامی اصلاح کی ہر تحریک کی مخالفت کرتے ہیں، اس کا مذاق اُڑاتے ہیں، اس کا راستہ روکتے ہیں، اسے نقصان دہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نظامِ ظلم ہی میں عوام کے لیے 'خیر وفلاح' کے پہلو نکال نکال کر دکھاتے ہیں۔

یہ ہے وہ ذہن، جس سے سامراجی حکمرانوں نے اس ملک پر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک حکومت کی، اور جب حالات سے تنگ آ کر انھیں اقتدار چھوڑنا پڑا، تب بھی وہ ملک پر احسان رکھ کر رخصت ہوئے۔ آیئے، سامراجیوں، جباروں اور ظالموں کے ذہن کے اس پہلو پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈالیں، تاکہ تاریخ برعظیم کا یہ گوشہ بھی ہمارے سامنے آجائے۔

'ظلم نہیں، محض ادائے فرض'

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ظالم جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ یہ باور کرانے پر زور لگاتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ 'احساسِ فرض' سے مجبور ہو کر کرتا ہے، جو بالکل صحیح ہوتا ہے۔ اس سے غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ سارا کھیل کھیلتا ہے اور اسی میں دوسروں کی فلاح سمجھتا ہے۔ دیکھیے جنرل ڈائر، جلیانوالہ باغ کے خونیں ہنگامے کی تحقیقات کرنے والی 'ہنٹر کمیٹی' کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کیا کہتا ہے؟

سوال: مسٹر جسٹس رنکن: معاف کیجیے جنرل، اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ کی جلیانوالہ باغ میں کل کارروائی خوف وہراس پھیلانے کے لیے کی گئی تھی، تو؟

جواب: جنرل ڈائر: نہیں، بالکل ایسا نہیں تھا۔ مجھے ایک بہت اندوہناک فرض

(duty) ادا کرنا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کیا وہ ایک رحم دلانہ اقدام (merciful thing) تھا۔ کیوں کہ مَیں سمجھتا تھا کہ مجھ کو گولی چلانی ہے اور سخت گولی چلانی ہے تاکہ میرے بعد کسی اور کو گولی چلانے کی ضرورت نہ پڑے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ میں مجمعے کو گولی چلائے بغیر منتشر کر دیتا، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ تھوڑی دیر بعد دوبارہ جمع ہوجاتے اور ٹھٹھے لگاتے اور میں بے وقوف بن کر رہ گیا ہوتا۔ [1]

واقعی لوگوں کو ہنسنے کا موقع دینے سے بڑا 'جرم' اور کیا ہوسکتا ہے؟ جو کام خون کی ایک بوند بھی بہائے بغیر ہوجائے، اس سے بھلا شانِ حکمرانی کا اظہار کہاں ہوسکتا ہے؟ اور پھر کمزور اور بے وقوف عوام، صاحبِ اختیار حکمرانوں کا مذاق اُڑائیں، یوں انھیں بے وقوف بنائیں؟ ان کا تو علاج ہی یہ ہے کہ ان کو توپ سے اُڑا دیا جائے، گولیوں کی بوچھاڑ سے بھون ڈالا جائے تاکہ یہ سر اُٹھانے کے لائق ہی نہ رہیں، اور یہ 'رحم دلانہ' کام احساسِ فرض کے ساتھ انجام دو، کہ خون میں تڑپتی ہوئی لاشوں کا رقص، نہتے اور پُرامن انسانوں کی ہنسی ٹھٹھے سے زیادہ خوش کن ہوتا ہے۔ جب تک پانی کی جگہ خون نہ بہالیا جائے، ظالم کی پیاس نہیں بجھتی!

'جمہوریت کے لیے ناموزوں'

پھر سامراجی حکمران اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ملک جمہوریت کے لیے قطعاً ناسازگار ہے۔ عوام میں اتنا شعور نہیں کہ اپنا مفاد خود سمجھ سکیں۔ اس لیے انھیں 'سیاسی مائی باپ' کی ضرورت ہے، جو ان ناپختہ، ناسمجھ، نابالغ اور آسانی سے گمراہ ہوجانے والے عوام کو ان کا 'بھلا' سمجھائے اور یہ سمجھیں یہ نہ سمجھیں، مگر حکمران انھی کے 'بھلے' کے لیے سرگرمِ عمل ہوجائیں اور زبردستی ان سے وہ کچھ کرائیں، جسے یہ اپنی نادانی میں بُرا سمجھ رہے ہیں۔ اصل 'خیرخواہ' تو وہی ہے، جو نادانوں کی بات کو نظرانداز کر کے وہی کرے، جو اس کے خیال میں ان کے لیے بہتر ہے۔

یہی ہے وہ راگ جو سامراجی دورِ استبداد کے حکمران برابر الاپتے رہے، ملک اور ملک سے باہر ان کے ہم نوا دانش ور، مفکر، مصلح، معلم اور صحافی سب اس آواز میں آواز ملاتے رہے۔ یہاں صرف چند نمایندہ مثالیں دی جاتی ہیں، ورنہ اس پہلو سے تو اتنا مواد ہے کہ اس سے متعدد کتابیں

---

[1] چودھری خلیق الزماں، شاہراہِ پاکستان، ص ۳۳۹-۳۴۰

تیار ہوسکتی ہیں۔

برطانیہ کے مشہور آزاد خیال مدبر جان مورلے [۱۸۳۸ء-۱۹۲۳ء] نے بیان دیا: ''ہندستان کے لیے جمہوریت قطعاً مفید نہیں، صرف مستقبل قریب ہی میں نہیں بلکہ میں تو صاف دیکھتا ہوں کہ مستقبل بعید میں بھی اس کا کوئی امکان نہیں کہ یہ خطۂ زمین جمہوریت کے لیے سازگار ہوسکے''۔ [1]

برطانیہ کے استعماری اور آمرانہ ذہن کا بہترین ترجمان پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر تھا۔ اس کی تمام تقاریر و تحریریں ایک استبدادی ذہن کی آئینہ دار ہیں۔ ہم چند اہم قومی مواقع پر اس کی تقاریر سے بطورِ نمونہ دو چار اقتباس پیش کرتے ہیں، تاکہ ظالم سامراجی حکمرانوں کا ذہن پوری طرح بے نقاب ہوجائے۔ اس سے ان کے استدلال کے طریقے، عوامی تحریکات اور مطالبات پر ان کا ردعمل اور لوگوں کو مطمئن کرنے (یعنی بے وقوف بنانے یا دراصل خود بے وقوف بننے) کے حربے بے نقاب ہوتے ہیں۔

'استحکام' نہ کہ، عوامی نمایندگی

گورنری کے عہدے پر متمکن ہونے کے بعد اوڈوائر نے حالات کا جائزہ لیا، تو آزادی اور جمہوری اختیارات کی تحریک اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھی اور اس نے طے کرلیا کہ وہ حکومتی استحکام اور عوام کی فلاح کا ایک فلسفہ گھڑ کر تحریکِ آزادی کے چہرے پر کالک مل کر رہے گا۔ ایسی کسی چیز کو برداشت کرنا نظامِ ظلم کی فطرت کے خلاف ہے لیکن ظالموں اور فرعونوں میں اتنی اخلاقی جرأت کہاں کہ صاف صاف اس کا اعتراف کریں۔ اب یہاں دیکھیے انگریز گورنر اوڈوائر کی نکتہ آفرینیاں:

> مجھے صوبائی حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ابھی کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ میرے پاس بعض لوگوں نے ایسی تجاویز بھیجنا شروع کردی ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ آیندہ اس صوبے کے نظم و نسق میں کیا کیا اصلاحات ہونی چاہییں۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جارہا ہے کہ حکومتِ خود اختیاری کے حصول کے لیے عوام جو اُمیدیں اور آرزوئیں قائم کیے بیٹھے ہیں، مجھے ان کی پذیرائی کیونکر کرنی چاہیے۔ عدالتی اور انتظامی اُمور کو

---

[1] جواہر لال نہرو، The Discovery of India، ص ۵۰۰

ایک دوسرے سے الگ کر دینے کی بھی تحریک ہو رہی ہے۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی خیالی اور غیر حقیقی باتیں اپنی جگہ کتنی ہی دل کش اور جاذبِ نظر کیوں نہ ہوں، اَمرِ واقعہ یہ ہے کہ حکومت کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کے جان و مال کی حفاظت کی جائے۔ اگر یہ مختلف تجویزیں [یعنی جمہوری تقاضوں کی تجاویز] بھیجنے والے لوگ مجھے یہ بتاتے کہ حکومت کو اپنے اصل مقصد سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کون سے بہتر ذرائع اختیار کرنے چاہییں، تو وہ اپنی قوم اور صوبے پر زیادہ احسان کرتے۔ [1]

'تنہا حاکمِ اعلیٰ'

جب اس 'قیمتی نصیحت' کا کوئی خاص اثر نہ ہوا اور جمہوری اداروں کا مطالبہ بڑھتا چلا گیا، عوام کی نمایندگی کے لیے ہر طرف سے آوازیں اُٹھنے لگیں اور گورنر سے نمایندہ انتظامی کونسل کی ضرورت پر شدت سے اصرار کیا جانے لگا، تو اوڈوائر صاحب کو سخت غصہ آیا اور وہ 'استحکام' اور 'ترقی' کا سہارا لے کر عوام پر یوں برسے:

مجھے یہ تجویز سن کر بے حد تعجب ہوا ہے۔ اس صوبے کے لوگ ابتدا سے لیفٹیننٹ گورنر کو صوبے کا تنہا حاکمِ اعلیٰ اور یہاں کے نظم و نسق کا بلاشرکت غیرے واحد ذمہ دار سمجھنے کے عادی ہیں۔ اس نظام کے تحت پنجاب نے خوب ترقی کی ہے اور مَیں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ضمن میں پنجاب، ہندستان کے کسی صوبے سے پیچھے نہیں رہا۔ پھر بتایئے کہ انتظامی کونسل کی کیا ضرورت ہے؟ [2]

گویا کہ فی الحقیقت ایسے 'استحکام' اور ایسی 'ترقی' کی موجودگی میں نمایندہ کونسلوں، اور جواب دہ اداروں کے مطالبے کا مقصد بجز 'انتشار' پھیلانے کے اور کیا ہوسکتا ہے!

آہ! دیہاتی! سیاست چھوڑ

بات انتظامی کونسل ہی کے مطالبے پر نہ رُکی، بلکہ نمایندہ قانون ساز اسمبلی، آزاد انتخابات

---

[1] اقبال کے آخری دو سال، ص ۳۴-۳۵

[2] ایضاً، ص ۳۷

اور عوام کے حق رائے دہی تک پہنچی۔ اب تو تنہا حاکمِ اعلیٰ اور بلاشرکت غیرے واحد ذمہ دار صاحب کا پارہ ہی چڑھ گیا۔ گویا ہوئے:

> آج کل یہ عالم ہے کہ چاروں طرف سے سیاسی تقریروں کا شور سن کر ہمارے کان بہرے ہوئے جارہے ہیں اور سیاسی دستاویزوں اور یادداشتوں کی بھرمار دیکھ دیکھ کر ہماری آنکھیں چندھیائی جارہی ہیں۔ کیا اس شوروشغب میں میرا یہ کہنا مناسب نہیں کہ اس طوفانِ بدتمیزی کو ختم کر کے ہمیں اپنے دل و دماغ کو لایعنی تصورات اور بے مصرف توہمات سے پاک کر دینا چاہیے، اور لمحے بھر کے لیے سوچنا چاہیے کہ آخر اس ساری سیاسی شعبدہ بازی کا ان غریب دیہاتیوں کو کیا فائدہ پہنچے گا، جن کی زندگیاں ہل چلانے، فصلیں بونے اور پھر ان فصلوں کو آفاتِ ارضی وسماوی سے محفوظ رکھنے کے لیے وقف ہوچکی ہیں۔ [1]

اللہ اللہ، دیہاتیوں کی قسمت کہ کون ان کے حقوق، قوم کو یاد دلا رہا ہے!

کمیشن رپورٹیں دریابرد کردو!

لیکن اسے کیا کہیے کہ 'سیاسی شعبدہ بازوں' کے 'لایعنی تصورات' برابر مقبول ہوتے گئے اور سیاسی اصلاحات کے لیے حکومت کو کمیٹی پر کمیٹی اور کمیشن پر کمیشن بٹھانے پڑے۔ 'مانٹی گو چیمس فورڈ کمیشن' [2] قائم ہوا اور اوڈوائر بھی اس کا معزز رکن تھا۔ تمام حالات کا جائزہ لے کر کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ عوام کو کچھ نہ کچھ حقوق دینے پڑیں گے اور کسی نہ کسی درجے میں عوامی نمایندگی کا

---

[1] اقبال کے آخری دو سال، ص ۸۷-۸۸

[2] پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) میں تاج برطانیہ اس بات پر خوش تھا، کہ اُس کے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے ہندستانی غلاموں کی فوج (رائل انڈین آرمی) میں گراں قدر خدمات انجام دیتے ہوئے ۳۶ ہزار فوجیوں نے جان کی قربانی دی اور ۷۰ ہزار سے زائد شدید زخمی ہوئے، جب کہ یہاں کے راجوں اور نوابوں نے تاجِ برطانیہ کو ایک ارب ۵۴ کروڑ روپے کا عطیہ بھی نذر کیا۔ ان خدمات کے اعتراف میں برطانوی حکومت نے برطانوی ہند کو کچھ مراعات دینے کی سبیل سوچی اور برطانوی وزیر ہند مانٹی گو اور برطانوی ہند کے گورنر جنرل چیمس فورڈ نے مجوزہ آئینی مراعات کی دستاویز تیار کی، ←

اہتمام کرنا ہوگا۔ کمیشن ہزار سرکاری سہی، اور سرکار ہی کے نامزد افراد پر مشتمل سہی، لیکن حقائق سے کہاں تک چشم پوشی کرسکتا ہے؟

مگر واہ رَے 'دیہاتیوں کی فلاح' اور 'عوام کے مفاد' کا محافظ! کمیشن کچھ بھی کہے گورنر اوڈوائر اپنی بات پر قائم ہے۔ اختلافی نوٹ میں اوڈوائر نے نام لے لے کر مسٹر محمد علی جناح، ڈاکٹر اینی بیسنٹ [م: ۲۰ ستمبر ۱۹۳۳ء] اور راجا صاحب محمود آباد [م: ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء] کو بُرا بھلا کہا۔ اس نے ان لیڈروں کی نیتوں پر حملہ کر کے انھیں خودغرض اور شورش پسند قرار دیا۔ ہوم رول تحریک کی جی بھر کر مذمت کی اور ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کو عوام کا بدخواہ ظاہر کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو اس نے ایک نہایت غیرنمایندہ جماعت قرار دے کر حکومت کو متنبہ کیا کہ مسلم لیگ نے مسلمان عوام کی نمایندگی کا جو دعویٰ کیا ہے، وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اور آخر میں لکھا: [1]

> یہ امر بالکل واضح ہے کہ اصلاحات کا تقاضا ملک کے عوام نے بالکل نہیں کیا۔ حالاں کہ عوام ہی کے مفاد کی نگہداشت حکومت کا فرض اوّلین ہونا چاہیے۔ یہ مطالبہ ہندستان کے باشندوں کی ایک نہایت قلیل تعداد کی طرف سے پیش ہوا ہے، جو محض اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے اقتدار کی خواہاں اور عہدوں کی بھوکی ہے۔ اگر ہمیں اپنے اس عہد کا کچھ پاس ہے، جو ہم نے ہندستان کی بے زبان مخلوق کی حفاظت کے لیے کیا تھا تو بلاشبہہ ہمارا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ہم اس بے زبان رعایا کے مفاد کو مقدم درجہ عطا کریں، اور سیاسی لیڈروں کے شوروشغب کی کچھ پروا نہ کریں، خواہ وہ اس شور سے قیامت ہی کیوں نہ برپا کردیں۔ میں یہاں [ایڈمنڈ] برک [م: ۹ جولائی ۱۷۹۷ء] کے وہ یادگار الفاظ درج کرنے پر مجبور ہوں کہ: اگر میدان کے کسی گوشے میں جھاڑی کے نیچے نصف درجن ٹڈے جمع ہوکر اپنی ٹیں ٹیں کے مکروہ شور سے آسمان سر پر اُٹھالیں اور اسی میدان میں شاہِ بلوط کے اُونچے اُونچے سایہ دار درختوں کے نیچے سیکڑوں گائے،

← جسے برطانوی پارلیمنٹ نے 'گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء' کے عنوان سے پاس کیا، اسی کو 'مانٹی گو چیمس فورڈ اصلاحات' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

[1] اقبال کے آخری دو سال، ص ۸۹

بھینسیں اطمینان سے بیٹھی جگالی کر رہی ہوں، تو ہمیں اس غلط فہمی میں ہرگز مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ میدان میں صرف چیخ پکار کرنے والے ٹڈے ہی آباد ہیں۔ اس سارے قضیے میں جو چیز بالکل عیاں اور واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان مجوزہ اصلاحات کا خاکہ تیار کرنے میں ہمارے سامنے صرف تعلیم یافتہ جماعت کے ایک محدود طبقے کی خوش نودی تھی۔ کیا ہمارا یہ فعل کسی اعتبار سے عقل مندی یا دانائی کی دلیل سمجھا جاسکتا ہے؟ تعلیم یافتہ جماعت کا یہ محدود طبقہ، جس کی خوش نودی کو ہم نے ہر حال میں مقدم سمجھ رکھا ہے، یہ دیہات کے عوام کی نمایندگی کا بھی دعوے دار ہے، حالاں کہ یہ دعویٰ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔

میرے اس قول کی صداقت کو آزمانے کے لیے آپ جو معیار چاہیں مقرر کرلیں، اس میں: مذہبی فسادات کی روک تھام کا سوال ہو یا فرقہ وارانہ اختلافات کو مٹانے کا مسئلہ درپیش ہو، فوجی بھرتی کے لیے رنگروٹوں کی فراہمی کا معاملہ ہو یا ملک کے دفاع کا سوال پیش نظر ہو، ہر حال اور ہر صورت میں شہروں کے تعلیم یافتہ سیاسی لیڈر آگے آنے کے بجاے گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ملک وقوم کے لیے مفید اور نفع بخش تحریکوں میں شرکت کرنا یہ لوگ گناہ سمجھتے ہیں۔ ہاں، جہاں فتنہ وفساد برپا کرنے یا شرانگیزی کی آگ بھڑکانے کی گنجایش ہوگی، آپ ان کو ہمیشہ آگے آگے پائیں گے۔ [1]

کیا آپ سمجھے کہ یہ 'فتنہ وفساد اور شرانگیزی کی آگ بھڑکانے والے' کون ہیں؟ تاجِ برطانیہ کے سرخیل سر مائیکل اوڈوائر، مسلم قائدین کی نیتوں پر حملے کرتے ہیں۔ ظالم حکمرانوں کا خاصا ہے کہ وہ صرف تعمیری اور اصلاحی تحریکوں کی مخالفت ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے معزز مخالفین کو بدنیت اور بدقماش بھی کہتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھ کے بڑے بڑے شہتیروں کو نظرانداز کردیتے ہیں اور دوسروں کی آنکھ میں کوئی تنکا نہ بھی ہو تو وہاں ان کو شہتیر ہی شہتیر نظر آنے لگتے ہیں اور ظالم حکمرانوں کو چبھتے بھی ہیں۔

اس ڈھٹائی کی انتہا ہے کوئی

اوڈوائر ہر بے ہودہ سے بے ہودہ اور ظالمانہ سے ظالمانہ قانون کی مدافعت کے لیے

---

[1] اقبال کے آخری دو سال، ص ۸۹-۹۱

سینہ سپر ہوجاتا ہے۔ رولٹ ایکٹ جو انتہائی سفاکانہ قانون تھا، جس کے متعلق سارا ملک چیخ اُٹھا تھا اور جسے وائسرائے ہند کو اپنے خصوصی اختیارات سے نافذ کرنا پڑا تھا کہ انگریزوں کے اپنے ادارے (قانون ساز اسمبلی) کے غیرسرکاری ارکان میں سے ایک بھی تائید کے لیے تیار نہ تھا (کم از کم اس وقت اتنی غیرت تو تھی)۔ جس کے استبدادی انداز سے (arbitrarily) نافذ کرنے پر قائداعظم نے مرکزی اسمبلی سے بطورِ احتجاج استعفا دے دیا تھا اور جس کے ظالمانہ ہونے کا احساس خود گورنمنٹ کو بھی اس درجہ تھا کہ 'راج ہٹ' میں اسے منظور تو کرلیا، لیکن عالم گیر احتجاج کے پیش نظر اس کی پوری مدتِ عمر جو تین برس تھی، اس میں ایک بھی اقدام نہ کیا۔ اس گھناؤنے قانون کی مدافعت کے لیے عوام کے 'مفاد کا محافظ' سر مائیکل اوڈوائر اس نفرت بھرے ذہن کے ساتھ کلام کرتا ہے:

> آپ نے گذشتہ ہفتوں کے واقعات [اشارہ ہے 'رولٹ ایکٹ' کے خلاف ملک گیر احتجاج اور اس کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال کی طرف جس میں جلیانوالہ باغ کا خونیں واقعہ بھی شامل ہے] اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں کہ ایک ایسے قانون کو، جو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے وضع کیا گیا تھا اور جس کا تنہا مقصد یہ تھا کہ بدامنی اور بغاوت کے طوفان کا سدباب کیا جائے، کس کس انداز سے توڑ مروڑ کر اور مسخ شدہ صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا جارہا ہے، تاکہ جھوٹ پر مبنی ان ہتھکنڈوں سے لوگوں کو گمراہ کرنے میں آسانی ہو۔ یہ سب کچھ ایک ایسے طبقے کے افراد کر رہے ہیں، جن کی تعداد بے حد قلیل ہے، لیکن شور مچانے اور چیخ پکار کرنے میں بہت ماہر ہیں۔ یہ لوگ اس قانون کو ایک خطرناک ہوّا بنا کر عوام کو خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں، حالاں کہ اس قانون کا مقصد صرف یہ ہے کہ غیرمعمولی حالات میں عوام کے جان و مال کی حفاظت کیوں کر کی جاسکے۔ موجودہ تحریک بے معنی اور غلط ہے۔ تحریک چلانے والوں کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کے خلاف بددلی پھیلائی جائے اور سرکار [برطانیہ] کے نمک خواروں کو ذلیل کیا جائے۔ حکومت کے وفادار باشندوں کا فرض ہے کہ وہ اس شرانگیز تحریک کا مقابلہ کریں۔ آپ کے سیاسی خیالات کچھ بھی ہوں، آپ کا فرض ہے

کہ حکومت کے دست و بازو بن کر موجودہ تحریک کو کچلنے میں ہماری مدد کریں۔ [1]

افسوس اس کا نہیں کہ اوڈوائر نے ایسی لچر، پوچ اور خیانت سے لبریز بات کہی۔ افسوس اس کا ہے کہ اہلِ ملک ہی میں سے اسے استبداد کے ہاتھ مضبوط کرنے والے مل گئے۔

راج ہٹ

جب حالات قابو میں آتے دکھائی نہیں دیتے ہیں تو سامراج کا گلِ سرسبد اور ظلم کا پیکر سر مائیکل اوڈوائر خون کی ندیاں بہانے کے لیے بھی آمادہ ہوجاتا ہے اور اس 'کارِخیر' کے لیے بھی اہلِ وطن ہی کی مدد حاصل کرتا ہے۔ اسی طویل تقریر میں آگے جاکر کہتا ہے:

> حالات نازک صورت اختیار کرتے جارہے ہیں اور فوری اقدام کے محتاج ہیں۔ اب آپ مزید تامل نہ کیجیے اور فوراً کمر ہمت باندھ لیجیے۔ حکومت نے تو گومگو کی پالیسی ترک کردی ہے۔ آپ بھی اُٹھ کھڑے ہوں، حکومت اس مہم میں ہرلمحہ آپ کے لیے پشت پناہ ثابت ہوگی۔ حکومت نے قانون کے نفاذ کا مصمم ارادہ کرلیا ہے، خواہ اس کام میں خون کی ندیاں کیوں نہ بہہ جائیں۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو یاد رکھنا چاہیے کہ اس تمام خون خرابے کی ذمہ داری ہم پر نہیں، بلکہ ان پر عائد ہوگی جو قانون شکنی کی تلقین کررہے ہیں [یعنی جو رولٹ ایکٹ کی مخالفت کی تحریک چلا رہے ہیں]۔ [2]

سر مائیکل اوڈوائر ایک فرد نہیں، بلکہ وہ استعمار کی زبان ہے، ظلم کا نمایندہ ہے، نظامِ استبداد کا ترجمان ہے اور اس کا ذہن آمریت کے ذہن کا آئینہ دار ہے۔ اس کی تقاریر میں وہ پوری فکر موجود ہے، جس کی حکمرانی برعظیم پاک و ہند پر رہی ہے اور جو ہمیشہ سے اربابِ ظلم کی ذہنیت رہی ہے۔ ایک ہی طرز پر سوچنے اور کام کرنے سے یہ ذہن اتنا پختہ ہوجاتا ہے کہ صرف دوسروں ہی کے سامنے جھوٹ کو سچ، ظلم کو رحم اور استبداد کو استحکام بنا کر پیش نہیں کرتا، بلکہ اپنے کو بھی دھوکا دینے لگتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ: ''غلام اپنی زنجیروں سے محبت کرنے لگے ہیں اور ان کا قائم کردہ آمرانہ نظام دراصل ایک جمہوری اور نمایندہ نظام ہے اور عام انسانوں کی خواہش کے عین مطابق ہے''۔

---

[1] اقبال کے آخری دو سال، ص ۱۰۵-۱۰۷

[2] ایضاً، ص ۱۰۸-۱۰۹

لارڈ لیٹن جو بڑے جمہوریت پسند اور برطانوی لبرل پارٹی کے ایک لیڈر تھے۔ وہ ہندستان میں ایک صوبے کے گورنر کے فرائض بھی انجام دے چکے تھے۔ ۱۹۳۵ء کے 'قانونِ ہند' کے آنے سے کچھ ہی قبل، اس وقت جب پورے ملک میں سیاسی بیداری کا غلغلہ تھا اور نمایندہ حکومت اور جمہوری اصلاحات کا مطالبہ ہو رہا تھا، ہاؤس آف لارڈز میں نہایت ڈھٹائی کے ساتھ فرماتے ہیں:

> ہندستان کے سیاست دانوں اور کانگریس کے مقابلے میں حکومتِ ہند کہیں زیادہ نمایندہ ہے۔ یہ حکومت سرکاری حکام، فوج، پولیس، نوابوں اور مہاراجوں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی فوجی یونٹوں کے نام پر اور ان کی طرف سے گفتگو کرسکتی ہے۔ مَیں جب ہندستان کی رائے عامہ کی بات کرتا ہوں تو میری مراد وہ لوگ ہوتے ہیں، جن کے تعاون پر مجھے بھروسا کرنا ہوتا ہے اور جن کے تعاون پر آیندہ کے وائسرائے اور گورنروں کو اعتماد کرنا ہوگا۔ [1]

یہ ہے وہ فلسفۂ حاکمیت جو استعماری حکمرانوں نے وضع کیا، ظلم و استبداد اور آمریت کے انتہائی گھناؤنے نظام کا نام 'جمہوریت' اور 'نمایندہ حکومت' رکھا، اور عوام کے نام پر ان کے مفاد کا نعرہ لگا کر انھی کا گلا گھونٹنے اور ان کو اُلٹی چھری سے ذبح کرنے کی سعی کی۔

۵

یہ سامراجی دورِ اقتدار، نفاق، سیاسی دھوکے بازی اور بین الاقوامی غنڈا گردی کی بدترین مثال پیش کرتا ہے۔ اس کے ریکارڈ پر ایک نگاہ ڈالنے سے انسانیت شرم سے پانی پانی ہوجاتی ہے، ضمیر بغاوت کرتا ہے اور روح کانپ اُٹھتی ہے کہ انسان شیطان کا اتنا بڑا حلیف بھی بن سکتا ہے بلکہ اس سے دو چار ہاتھ آگے بھی نکل سکتا ہے۔

اس گھر کو آگ لگ گئی...

اس شرم ناک داستان کا ابھی ایک باب اور بھی ہے، جو انتہائی کریہہ اور گھناؤنا ہے اور

---

[1] تقریر، ہاؤس آف لارڈز، ۱۷ دسمبر ۱۹۳۴ء

جس کے ذکر پر آنکھیں شرم سے جھک جاتی اور خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ یہ ہے انگریزوں کے ہندستانی وفاداروں کا کردار!

اگر ظالم حکمران ہماری ہڈی پسلی ایک کر دیتے اور ایک ایک فرد کو ذبح کر ڈالتے تو انسانیت خواہ اس پر کتنا ہی ماتم کرتی، لیکن اہلِ وطن کے لیے شرم و ندامت کا کوئی موقع نہ ہوتا ___ اپنا سر فخر سے بلند کر کے کہہ سکتے کہ: ''غیروں نے ہمارے اُوپر ظلم کیا اور ہم نے سینہ سپر ہو کر اس کا مقابلہ کیا''۔ باعثِ افتخار ہیں وہ مظلوم جنھوں نے اپنی جانیں دے دیں لیکن اپنے ضمیر نہیں بیچے۔ لیکن افسوس کہ خاکِ وطن ہی سے کچھ ایسے بے ضمیر بھی نکل آئے، جو ظالموں کا آلۂ کار بنے اور اس وقت جب استعمار اور استبداد کے نمایندے ابنائے وطن کا گلا گھونٹ رہے تھے، انھوں نے فیصلہ کیا کہ ان ظالموں کے ہاتھ مضبوط کریں گے، تاکہ وہ مظلوموں کا گلا اور بھی قوت کے ساتھ گھونٹ سکیں، آہ!

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم و ننگِ دیں، ننگِ وطن [1]

ملک کے غدار، سامراج کے وفادار

سامراجیوں کو آخری وقت تک 'میر جعفروں' اور 'میر صادقوں' کی بِس بھری فصل ملتی رہی اور انھوں نے ملک و ملّت کے ساتھ غداری ہی نہیں کی، بلکہ اپنی اس وفادار ذُریت کو بھی زندگی کے

---

[1] میر جعفر علی خاں [۱۶۹۱ء-۱۷۶۵ء]، نواب آف بنگال سراج الدولہ [۱۷۳۳ء-۲ جولائی ۱۷۵۷ء] کی فوج کا ایک سردار تھا، جو ترقی کر کے سپہ سالار بن گیا۔ اس کی نظر بنگال کی نوابی پر تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے میجر جنرل رابرٹ کلائیو [م: ۲۲ نومبر ۱۷۷۴ء] سے مل کر سازش کا تانا بانا بُنا، اور غداری کرتے ہوئے جنگِ پلاسی [جون ۱۷۵۷ء] میں سراج الدولہ کی شکست کا ذریعہ بنا۔ انگریزوں نے اس کے صلے میں جعفر کو برائے نام 'نواب آف بنگال' بنانے کا اعلان کیا۔ یاد رہے، پاکستان کے پہلے صدر اسکندر مرزا [۱۸۹۹ء-۱۹۶۹ء]، میر جعفر کی اولاد سے تھے (دیکھیے اسکندر مرزا کے بیٹے ہمایوں مرزا کی کتاب: From Plassey to Pakistan، ناشر: یونی ورسٹی پریس آف امریکا، لین ہم، میری لینڈ، ۱۹۹۹ء)۔ اسی طرح دوسرا کردار میر صادق [م: ۴ مئی ۱۷۹۹ء] سلطان فتح علی ٹیپو کی کابینہ میں وزیر تھا، جو سرنگا پٹم کے محاصرے کے دوران حملہ آور انگریزی فوجوں کا ساتھ دے کر سلطان ٹیپو کی شکست اور شہادت کا سبب بنا۔ وہ انگریزی فوج کو مبارک باد دینے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ اسی روز ٹیپو کے ساتھیوں نے اُسے قتل کر دیا۔

ہر شعبے پر مسلط کرنے اور آگے بڑھانے کی منظم اور مربوط کوشش کی۔ سفاک رومی شہنشاہ نیرو [م:۶۸ء] کا صرف یہ جرم تھا کہ جب روم جل رہا تھا تو وہ بانسری بجا رہا تھا، مگر پاک و ہند کے نیرو صرف بانسری ہی نہیں بجا رہے تھے بلکہ آگ پر تیل بھی چھڑک رہے تھے اور شعلوں کے اُٹھنے اور مظلوموں کے کراہنے اور چیخنے سے جو خوف ناک منظر رُونما ہو رہا تھا، اس کے 'حُسن و جمال' کی تعریف میں تقریریں بھی کر رہے تھے۔ دل پر جبر کر کے اپنی تاریخ کے اس سیاہ باب سے بھی چند منتشر اوراق یہاں پیش کیے جا رہے ہیں، تاکہ اس طبقے کا رُخِ کردار بھی سامنے رہے۔

اگر ملکی غدار انگریزوں کا ساتھ نہ دیتے تو وہ ہندستان کو کبھی فتح نہ کر سکتے تھے۔ ان کو یہاں سے مخبر اور فوجی ہی نہ ملے بلکہ اعلیٰ سرکاری افسر بھی مل گئے، جنھوں نے ملک اور حکومت سے غداری کی اور وطن کے دروازے غیروں کے لیے کھول دیے۔ نواب سراج الدولہ [1] اور فتح علی ٹیپو سلطان [۱۷۵۰ء-۴ مئی ۱۷۹۹ء] کو انگریزوں کی قوت نے زیر نہیں کیا، ان کی چالاکی اور عیاری اور اپنوں کی بے وفائی اور غداری نے شکست سے دوچار کیا، اور جب حفاظت و دفاع کی یہ دونوں مضبوط فصیلیں ٹوٹ گئیں تو انگریز پورے ملک پر حکمران ہو گیا ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

انگریز کے پورے دورِ اقتدار میں 'سرکار پرستوں' کا ایک طبقہ تھا، جو استعماری حکمرانوں کے آگے پیچھے پھرتا رہا اور زندگی کے ہر شعبے میں ان کے اقتدار کو مستحکم کرنے میں مصروف رہا۔

سامراج کے خلاف خفیہ سرگرمیوں کا آغاز ہوا، تو اپنوں نے مخبری کی۔ مولانا محمود حسن صاحب [۱۸۵۱ء-۱۹۲۰ء] کی انقلابی سرگرمیوں سے دیوبند ہی کے چند طلبہ نے انگریزی حکومت کو مطلع کیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی [۱۸۷۲ء-۱۹۴۴ء] کو جو رقوم مولانا شوکت علی [۱۸۷۳ء-۱۹۳۸ء] نے افغانستان اور عرب دنیا میں کام کرنے کے لیے بھیجی تھیں، ان کا راز انھی کے ایک بدبخت شاگرد نے فاش کیا۔ آزادی کے حصول کی کم و بیش تمام قومی تحریکوں میں انگریزوں کے جاسوس گھسے ہوئے

---

[1] بنگال پر برطانوی قبضے کے ابتدائی مرحلے کے بارے میں یہ کتب مفید معلومات مہیا کرتی ہیں:
● بی کے گپتا، *Sirajuddaulah and East India Company*، لیڈن، ۱۹۶۲ء۔ ● آر گو پال، *How the British Occupied Bengal*، لندن، ۱۹۶۳ء۔ ● ایم آورڈ، *Plassey: The Founding of an Empire*، لندن، ۱۹۶۹ء ● ایم بینز جونز، *Clive of India*، لندن، ۱۹۷۴ء۔

تھے اور ان سرفروشوں کی سرگرمیوں سے ان کو باخبر رکھتے تھے۔ پھر انگریز کی وفاداری اور اس کے راج کی 'برکات' کو بیان کرنے کے لیے سیکڑوں افراد نے اپنی خدمات پیش کر رکھی تھیں اور عوام کو افیون کی یہ گولی کھلائی گئی کہ: ''مزے سے زندگی گزارو، آزادی اور غلامی کے چکّر میں پڑ کر اپنی دُنیا کیوں خراب کرتے ہو؟''

باطل نظام میں حصّہ ڈالنے اور معمولی سے معمولی مناصب کے لیے بھاگ دوڑ کرنے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر خدمت اور وفاداری کا یقین دلانے کا کام بھی ایک طبقے نے انجام دیا اور اس طبقے کے لیے: خان صاحب، خان بہادر، رائے بہادر، سردار بہادر اور نائٹ ہوڈ کے اعزازات وضع کیے گئے۔ اگر انگریز حاکم، اہلِ ہند کو انتظامیہ میں لینے پر مجبور ہوا تو یہی لوگ اس کے خدمت گزار بن کر سامنے آئے اور انگریز کے نمک خوار کی حیثیت سے ہمیشہ پیش پیش رہے۔ آزادی اور جمہوریت کی تحریک کو کچلنے، اس کی راہ میں روڑے اٹکانے اور لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ ''انگریز کے راج میں ہر قسم کی آزادی ہے''، اس طبقے نے وہ وہ باتیں گھڑ لیں کہ ان کو پڑھ کر آدمی شرم سے پانی پانی ہوجاتا ہے، مثال کے طور پر:

- جب مطالبہ کیا گیا کہ 'ہندستان کی فوج کا کمانڈر ہندستانی کو ہونا چاہیے' تو ایک سر صاحب نے ارشاد فرمایا: ''ہندستان میں کوئی اس کا اہل بھی ہے کہ کمانڈر انچیف ہوسکے''۔ اور اسی بنیاد پر رام پور کے نواب سر رضا علی خاں[1] [۱۹۰۸ء-۱۹۶۶ء] نے ۱۹۳۱ء کے کُل ہند مسلم لیگ سیشن میں حصولِ آزادی کی قرارداد کی کھل کر مخالفت بھی کی۔
- خدا بخش [۱۸۴۲ء-۱۹۰۸ء]، سر امیر علی [۱۸۴۹ء-۱۹۲۸ء] اور سر آغا خان [۱۸۷۷ء-۱۹۵۷ء] کی حیثیت کے لوگ بھی انگریزی اقتدار اور اس کے فوائد و برکات کے قصیدہ خواں رہے اور زیادہ سے زیادہ جو بات سوچ سکے، وہ انگریزوں کی حکومت میں کچھ مراعات کا حصول تھی۔ اس سے زیادہ سوچنا ان کی نگاہ میں بغاوت تھا۔
- ریاستوں میں جمہوری اداروں کے قیام کا سوال اُٹھایا گیا تو برطانوی مقبوضہ پنجاب کے گورنر سر میلکم ہیلے [۱۸۷۲ء-۱۹۶۹ء] نے اس کا مذاق اُڑایا اور ریاستوں میں مطلق العنان

---

[1] سر رضا علی خاں [خودنوشت] اعمال نامہ، ناشر: ہندستانی پبلشرز، دہلی، دسمبر ۱۹۴۳ء

حاکمیت کا دفاع کیا۔ راجوں اور مہاراجوں نے بڑا شور مچایا، کانفرنسیں کیں اور اس رجحان کی مخالفت کی تو اس موقعے پر ایک سر مرزا محمد اسماعیل [۱۸۸۳ء- ۱۹۵۹ء] نے ۲۱ جون ۱۹۲۴ء کو ارشاد فرمایا: ''مجھے ریاستوں میں غیر معمولی اصلاحات کے مطالبے نے اچنبھے میں ڈال دیا ہے۔ تعجب ہے کہ یہاں جمہوریت کا مطالبہ کیا جارہا ہے، جب کہ پارلیمانی جمہوریت ساری دنیا میں رُوبہ زوال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ریاست کا ضمیر اس پر مطمئن ہے کہ جو اساسی دستور یہاں رائج ہے، وہ تمام عملی مقاصد کے حصول کے لیے خاطر خواہ حد تک جمہوری ہے''۔

- اور وہ اعلان تو ابھی تک بہت سے لوگوں کے کانوں میں گونج رہا ہے، جو صوبہ پنجاب کے ایک اور بڑے مشہور، سر فیروز خان نون [۱۸۹۳ء-۱۹۷۰ء] نے خود اقوامِ متحدہ میں کیا تھا کہ: ''ہندستان کی آزادی کا سوال مضحکہ خیز ہے۔ ہم تو آزاد ہیں، اور دیکھو، مَیں ایک ہندستانی، ہندستان کے نمایندے کی حیثیت سے اس اجلاس میں شرکت کر رہا ہوں''۔

یہ ہے وہ طبقہ، جس کا کردار برعظیم کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ اس نے آزادی کی جنگ کو کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کی وجہ سے آزادی کی جدوجہد غیر ضروری طور پر طویل اور صبر آزما ہوئی۔ اس کی بنا پر انگریز اپنے اقتدار کو ایک طویل مدت تک کھینچ سکا اور اہلِ وطن پر مظالم و شدائد کے پہاڑ توڑ سکا۔ سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ، جب آخرکار انگریز کا اقتدار ختم ہوتا نظر آیا اور قومی حکومتیں بننے لگیں، تو یہی طبقہ پوری بے شرمی اور عیاری کے ساتھ انھی تحریکوں میں شامل بھی ہوگیا۔ اسے اپنا مسلک بدلنے میں اتنی دیر بھی نہ لگی جتنی کوٹ بدلنے میں لگتی ہے۔ اس نے یہ سب کچھ کیا اور ضمیر کی کوئی چبھن محسوس نہ کی:

یہ مسجد ہے، یہ میخانہ، تعجب اس پہ آتا ہے
جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

اس طبقے کے کردار پر بہترین تبصرہ خود اسی کے ایک ولیِ نعمت مسٹر لائیڈ جارج [۱۸۶۳ء-۱۹۴۵ء] سابق وزیراعظم برطانیہ [۱۹۱۶ء-۱۹۲۲ء] کا یہ جملہ ہے:

Specimens of these changable reptiles who adopt their hue to their enviroments.

زمین پر رینگنے والے تغیر پذیر جانوروں کی وہ طرفہ مخلوق جو ہر ماحول کے مطابق اپنے رنگ بدل لیتی ہے۔ [1]

اقتدار کے سورج کو نئے محور پر گردش کرتے دیکھ کر اس طبقے نے بلاشبہہ اپنا رنگ بدل لیا۔ لیکن کیا اس کے سوچنے کا انداز، گفتگو کا طریقہ اور کام کرنے کے آداب بھی بدل گئے یا وہی پرانا ذہن باقی رہا؟ دورِ سامراج کی تربیت بڑی پختہ تھی اور جو طبقہ برطانیہ کی استعماری مشینری کا کُل پُرزہ تھا اس نے اپنا قبلہ تو ضرور بدلا مگر دل نہ بدلا۔ اس میں وہی لات و منات موجود رہے اور اسی سامراجی ذہن نے اظہار کے لیے نئے نئے میدان تلاش کر لیے۔

یہاں پر صرف ایک مثال، پاکستان کے پہلے صدر [مارچ ۱۹۵۶ء-اکتوبر ۱۹۵۸ء] اسکندر مرزا [2] کی تقریر سے پیش کی جارہی ہے، جس سے اس طبقے کی اصل ذہنی کیفیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ ہے اُس شخص کی تقریر کا اقتباس، جو ملکِ عزیز کے اہم ترین منصبِ صدارت پر فائز رہا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جس کو اقتدار سے ہٹائے جانے پر نہ صرف یہ کہ ایک آنکھ بھی نہ روئی اور ایک زبان بھی شکوہ سنج نہ ہوئی، بلکہ پوری قوم نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسکندر مرزا ایک فرد نہیں ایک ذہن کے ترجمان تھے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ آج کل بڑے فخر سے استعمال کی جانے والی ایک اصطلاح میں 'ایک نظریہ' تھے۔ ذرا یہ بھی دیکھیے کہ ان کے سوچنے کے انداز اور بولنے کے طریقے میں اور جنرل اوڈوائر کے فکر و گفتار میں کتنی یک رنگی اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ جناب اسکندر مرزا کا ارشاد (۳۱/اکتوبر ۱۹۵۴ء) ہے:

اس ملک کے عوام کی عظیم اکثریت جاہل اور اَن پڑھ ہے۔ ان کو سیاست سے کوئی حقیقی دل چسپی نہیں ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کبھی کبھی نہایت احمقانہ رویہ اختیار

---

[1] ترجمے میں اصل عبارت کے لطیف طنز کو منتقل کرنا مشکل ہے، اس لیے کہ reptile کے ایک معنی تو 'رینگنے والے جانور' ہیں اور انگریزی محاورے میں اس کے دوسرے معنی، یعنی وہ ذلیل انسان ہیں، جو ہاں میں ہاں ملاتے ہوں۔ اسی لیے خوشامدی اخبارات و جرائد کو reptile press کہا جاتا ہے۔ لائیڈ جارج نے یہاں پر enviroments (جمع) کو ہر 'ماحول' سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جمع کے صیغے نے اس میں جو زہرناکی پیدا کر دی ہے اس پر داد نہ دینا کور ذوقی ہوگی۔

[2] دیکھیے: ہمایوں مرزا، *From Plassey to Pakistan*، میری لینڈ، ۱۹۹۹ء

کرتے ہیں، جیسا کہ مشرقی پاکستان کے حالیہ انتخابات [۱۹۵۴ء] میں انھوں نے اختیار کیا۔ اور پھر جیسا ان کے منتخب نمایندوں نے دستور ساز اسمبلی میں اختیار کیا۔ اس ملک کے عوام کی اصل ضرورت مضبوط اور مستحکم حکومت ہے، اسی لیے ابھی ایک مدت تک ان کو پابند اور محدود جمہوریت (Controlled Democracy) دی جانی چاہیے۔ [1]

دیکھیے، وہی ذہن کس طرح کام کر رہا ہے۔ جنرل اوڈوائر کی تقریر ہٹایئے اور اسکندر مرزا کی تقریر سامنے رکھیے، کوئی فرق آپ محسوس کرتے ہیں؟ ایک ہی ذہن ایک ہی زبان ہے، ایک ہی انداز ہے، ایک ہی قسم کے وعدے ہیں اور ایک ہی طرح استحکام، مضبوط حکومت اور عوام کے مفاد کا رونا ہے ع

انھی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات اُن کی

۶

سامراج کے وحشیانہ استبداد اور وطن کے چند ناخلف فرزندوں کی غداری نے حالات کو اتنا ابتر اور تاریک کر دیا تھا کہ ظلم و استعمار کی اس طویل رات کے ختم ہونے کا امکان نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اللہ کی رحمتیں ہوں اُن مجاہدوں اور جان فروشوں پر، جنھوں نے ظلمت کے ان طوفانوں میں حق پرستی اور آزادی و جمہوریت کے چراغ روشن کیے اور اپنے خون سے ان کو تابندہ تر کیا۔ چمگادڑیں تو یہ منصوبہ بنا چکی تھیں کہ یہ رات کبھی ختم نہ ہو، لیکن روشنی و نور کے علَم بردار اپنی جانوں پر کھیل کر بھی فضا کو منور کرنے میں مصروف رہے۔ بالآخر مزاحمت کی ہوائیں چلیں جو تاریک بادلوں کو اُڑا کر لے گئیں اور آفتابِ آزادی ضوفشاں ہوا۔

ظلم کے اندھیروں میں روشنی کے مینار

ذرا چشمِ تصوّر سے ماضی کے تاریک دھندلکے میں دیکھیے، کیسے کیسے حسین جگنو چمکتے دکھائی

---

[1] روزنامہ Dawn، کراچی، ۳۱ر اکتوبر ۱۹۵۴ء، بحوالہ کیتھ کلارڈ، Pakistan: A Political Study، ناشر: ایلن اینڈ انون، لندن، ۱۹۵۷ء، ص ۱۴۲

دیتے ہیں اور کیسی کیسی شمعیں فضا کو منور کرنے کے لیے اپنے کو جلاتی نظر آتی ہیں:

- امپریلزم کے ایجنٹ مکر و سازش کے اسلحے سے مسلح جنوب کی طرف بڑھ رہے ہیں اور سلطان حیدر علی خان [۱۷۲۰ء-۱۷۸۲ء] اور ٹیپو سلطان آہنی دیوار بن کر ان کا راستہ روک لیتے ہیں۔ آزادیِ وطن کی خاطر ہر وار اپنے سینے پر برداشت کر لیتے ہیں، حتیٰ کہ یہ کہتے ہوئے آخر کار جان بھی دے دیتے ہیں کہ: ''شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے''۔
- تحریکِ مجاہدین کے جاں باز ملک کے گوشے گوشے سے کھنچ کر سرحدی صوبہ (موجودہ خیبر پختونخوا) میں جمع ہوتے ہیں اور دینِ حق اور آزادیِ وطن کی خاطر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر دیتے ہیں۔
- ۱۸۵۷ء کا معرکۂ آزادی گرم ہوتا ہے اور ہزاروں انسان آزادی کی خاطر پروانہ وار فدا ہو جاتے ہیں۔
- استعمار کے خلاف آزادی کی کھلی اور خفیہ تحریکیں اُبھرتی ہیں اور سیکڑوں نہیں ہزاروں نوجوان اس جدوجہد کی کامیابی کے لیے اپنی زندگیاں تج دیتے ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، مولانا محمد جعفر تھانیسری [۱۸۳۸ء-۱۹۰۵ء]، مولانا سیّد حسین احمد مدنی [۱۸۷۹ء-۱۹۵۷ء] اور سیکڑوں جاں باز اس انقلابی کام کے لیے قیمتی قربانیاں دیتے ہیں۔ [1]

ایسی چنگاری بھی یارب...

مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸ء-۴ جنوری ۱۹۳۱ء] کی قیادت میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون اُٹھتی ہے تو سارے ملک میں ایک تہلکہ مچ جاتا ہے۔ اوکسفرڈ اور کیمبرج یونی ورسٹیوں کے پڑھے ہوئے نوجوان ڈاڑھیاں رکھ لیتے ہیں۔ پوری قوم انگریزی لباس ترک کر دیتی ہے، سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کر دیتی ہے، ملازمتیں چھوڑ دیتی ہے۔ جذبۂ سرفروشی سے سرشار جوانانِ وطن جیلوں کو بھر دیتے ہیں اور اہلِ دولت اس فراخ دلی کے ساتھ ان تحریکوں کی مالی مدد

---

[1] ملاحظہ ہو: نقشِ حیات از مولانا سیّد حسین احمد مدنی، علماے ہند کا شان دار ماضی (چار حصّے) از مولانا سیّد محمد میاں اور چودھری خلیق الزماں کی شاہراہِ پاکستان۔

کرتے ہیں کہ تقریباً ۲۰ ہزار خاندانوں کی کئی سال تک مالی دست گیری کی جاتی ہے۔ ملک وقوم پر دولت نثار کرنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو روپیہ لٹا کر لکھ پتی سے کنگال ہو گئے۔ [1]

- تحریکِ خلافت کے روحِ رواں محمد علی جوہر تھے لیکن ان کا کردار کیا ہے؟ مولانا محمد علی جوہر کے سامنے ایک طرف ایک ریاست کی وزارتِ عظمیٰ کی پیش کش کا خط ہے اور دوسری طرف بھیک مانگ مانگ کر قوم کی خدمت کا سودا ـــــ دو دن تک خط جیب میں پڑا رہتا ہے اور بالآخر اس خط کو پھاڑ کر اخبار Comrade نکال لیا جاتا ہے۔
- مولانا جوہر، ترکی کے خلاف انگریزوں کی جنگ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس جنگ میں مسلمان فوجیوں کی شرکت کو حرام قرار دے رہے ہیں۔ اس حق گوئی پر حکومت گرفتار کر لیتی ہے۔ خالق دینا ہال، کراچی میں بغاوت کا مقدمہ چلتا ہے لیکن قوم کا عزم ملاحظہ ہو کہ مولانا کی ۶ جولائی ۱۹۲۱ء والی تقریر، جس پر ستمبر ۱۹۲۱ء میں سات سال کی قید سنا دی گئی۔ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو ملک کے ہر گوشے میں اسی عزم کو دُہرایا جاتا ہے کہ:

گر اِک چراغِ حقیقت کو گل کیا تم نے
تو موجِ دود سے صد آفتاب اُبھریں گے

- خلافت اور عدم تعاون کی تحریک میں لاکھوں افراد جیلوں میں جاتے ہیں اور کروڑوں روپے کی املاک ضبط کی جاتی ہیں۔
- ترکِ موالات کی تحریک اُٹھتی ہے تو ۲۰ ہزار مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں ہندستان کو چھوڑ کر افغانستان ہجرت کرتے ہیں۔
- 'رولٹ ایکٹ' پاس ہوتا ہے تو ملک کے گوشے گوشے سے اس کی مخالفت کا اعلان ہوتا

---

[1] اس کی کئی مثالوں میں سے ایک مثال کا تذکرہ چودھری خلیق الزماں نے کیا ہے: ''گاندھی جی نے عمر سبحانی کے انتقال [۶ جولائی ۱۹۲۶ء] پر اپنے اخبار Young India میں لکھا: [۳۶ سالہ عمر سبحانی] کی موت نے ہندستان کے ایک بڑے قومی خدمت گزار کو اُٹھا لیا۔ ملک میں اپنے عظیم مالی نقصانات سے قبل کوئی ایسی تحریک نہیں تھی، جس میں انھوں نے کروڑوں کی شاہانہ امداد نہ کی ہو۔ اس کے باوجود وہ پبلک مجالس میں آنے کے خواہش مند نہ تھے بلکہ وہ اسٹیج کے پیچھے رہنا پسند کرتے تھے۔ قومی خدمت کے فنڈز ←

ہے اور لوگ اپنے خون سے اس اعلانِ بغاوت پر دستخط کرتے ہیں۔

- 'سائمن کمیشن' آتا ہے [1] تو سارے ملک میں کالی جھنڈیوں سے اور 'سائمن گو بیک' کے نعروں سے اس کا استقبال ہوتا ہے۔

ایک وہ بھی اسپیکر تھے!

سرکار پرستوں میں سے بھی کچھ کا ضمیر جاگتا ہے، ان کو بے چین کر دیتا ہے اور وہ اپنے خطابات واپس کر دیتے ہیں، عہدے چھوڑ دیتے ہیں اور میدانِ عمل میں نکل آتے ہیں۔ صرف ایک مثال دیکھیے کہ مرکزی اسمبلی کے پہلے غیر سرکاری اسپیکر وٹھل بھائی پٹیل نے ۱۹۳۰ء میں مستعفی ہو کر وائسرائے کو لکھا:

> میرے ہم وطن اس وقت موت اور زندگی کی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ ملک کے سیکڑوں نام وَر لوگ جیلوں میں قید ہیں۔ ہزاروں اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار بیٹھے ہیں اور لاکھوں ایسے ہیں جو اس زبردست تحریک کی خاطر زندان کی کال کوٹھڑی میں جانے کو بخوشی آمادہ ہیں۔ جہادِ حُریت کی تاریخ کے اس نازک موقعے پر میرا یہ کام نہیں کہ اسمبلی کی کرسیِ صدارت پر بیٹھا رہوں، بلکہ میرا فرض یہ ہے کہ اپنے بھائیوں کے پہلو بہ پہلو آزادیِ وطن کی جنگ میں حصّہ لوں۔ [2]

← ادا کرنے والوں کی فہرست میں جب ان کا نام سرورق نہ ہوسکا تو انھوں نے اپنے لیے یہی مناسب سمجھا کہ پبلک زندگی سے علیحدہ ہوجائیں۔ ان کی زندگی نوجوان دولت مندوں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ ہم سب کو ملک سے ایسی محبت ہونی چاہیے، جیسی عمر سبحانی کو تھی۔ جو نمونہ وہ ہمارے سامنے چھوڑ گئے، خدا ہم کو توفیق دے کہ اس جذبے کو زندہ رکھ سکیں''۔ (خلیق الزماں، شاہراہِ پاکستان، ص ۴۶۲-۴۶۳)

[1] ۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت نے برطانوی مقبوضہ ہند کے لیے آئینی اصلاحات کی غرض سے ایک کمیشن سرجان سائمن [م: ۱۱ جنوری ۱۹۵۴ء] کی سربراہی میں مقرر کیا۔ کمیشن کے تمام ارکان انگریز تھے، اس لیے اسے 'گورا کمیشن' بھی کہا گیا۔ کمیشن کے دائرۂ کار کو مدنظر رکھتے ہوئے پورے ہند میں شدید ردِعمل پایا جاتا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ ۷ جون ۱۹۳۰ء کو شائع ہوئی۔

[2] دیکھیے: *The Indian Annual Register 1930*، جلد اوّل، ص ۱۰۳، بحوالہ اقبال کے آخری دو سال، ص ۲۶۸

بھگت سنگھ [۱۹۰۷ء- ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء] اور اس کے ساتھی سنٹرل جیل لاہور میں جس وقت مقدمے کی کارروائی کے دوران خوش الحانی کے ساتھ یہ ترانہ گاتے تھے کہ:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوے قاتل میں ہے

تو اس ترانے سے کمرۂ عدالت ہی نہیں، پوری جیل کی فضا بدل جاتی تھی۔ جوش، تہور اور ایثار و سرفروشی کی چنگاریاں سنٹرل جیل کی دیواروں کو چیر کر نوجوانوں کو آتش بجاں اور شعلۂ بداماں کر دیتی تھیں۔[1] کونے کونے سے آزادی کے ترانے سنائی دیتے تھے، کوڑے پڑتے تھے، بَید لگتے تھے لیکن زبان سے یہی نغمے ارتعاش پیدا کرتے تھے۔

مَیں جیل اور گولی کے لیے تیار ہوں!

علّامہ محمد اقبال جن کی امن پسندی اور طبیعت کی خاموشی ضرب المثل تھی، وہ بھی ان حالات میں سرفروشی کے جذبے سے اس قدر سرشار تھے کہ قائداعظم کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''ذاتی طور پر مَیں ایک ایسے مسئلے کی خاطر جس کا تعلق اسلام اور ہندستان سے ہے، جیل جانے کو تیار ہوں۔

علّامہ اقبال دو سال سے صاحبِ فراش تھے، سرگرم سماجی زندگی معطل تھی اور عملاً ہل جل نہیں سکتے تھے۔ لیکن مسجد شہید گنج کے واقعے پر ان کی طبیعت میں شدید بے چینی اور اشتعال تھا۔ وفات سے تین ماہ قبل ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو ہائی کورٹ کے فل بنچ نے مسجد شہید گنج کی اپیل خارج کر دی تو مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوگیا۔ اسی شام غلام رسول خاں نے ڈاکٹر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ: ''اب کیا کرنا چاہیے تو ڈاکٹر صاحب رو پڑے اور کہنے لگے:

مجھ سے کیا پوچھتے ہو میری چارپائی کو اپنے کندھوں پر اُٹھاؤ اور اس طرف لے چلو جدھر مسلمان جا رہے ہیں۔ اگر گولی چلی تو میں ان کے ساتھ مروں گا۔[2]

---

[1] اقبال کے آخری دو سال، ص ۲۶۸، مذکورہ بالا شعر رام پرشاد بسمل شاہ جہاں پوری کا ہے، جو یوپی کے انقلابی نوجوان تھے، جنھیں انگریز حکومت نے پھانسی کی سزا دی تھی۔

[2] اقبال کے آخری دو سال، ص ۵۳۵-۵۳۶

اندھیرا چھٹتا ہے!

انھی جاں فروشوں کے جہدِ مسلسل، قربانیوں اور خون سے تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان کے چراغ روشن ہوئے، اور دُنیا کے نقشے پر ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آیا۔ خلوص اور جذبۂ قربانی کے ان چراغوں کی گرمی نے غلامی اور استبداد کی زنجیروں کو پگھلا دیا۔ ظلم کی تلوار کو حق کے لیے جاں بازی کے اخلاقی ہتھیار نے کاٹ کر رکھ دیا۔

ظلم و استبداد بظاہر کتنے ہی مرعوب کن کیوں نہ ہوں، بہ باطن بہت کمزور ہوتے ہیں اور اہلِ حق جب مقابلے پر ڈٹ جاتے ہیں تو اربابِ ظلم بہت جلد ہمت چھوڑ دیتے ہیں۔ آہنی حصار تارِ عنکبوت ثابت ہوتے ہیں اور بظاہر کمزور اہلِ حق کے خلوص، عزم اور قربانی کے ریلے میں اس طرح بہہ جاتے ہیں، جس طرح سیلاب میں خس و خاشاک۔ یہی فطرت کا قانون ہے، یہی اللہ کی سنت ہے، یہی تاریخ کا سبق ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو اللہ کی زمین ظلم و فساد سے بھر جائے:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۟ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (البقرہ ۲:۲۴۹-۲۵۱) بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔ اور جب وہ جالوت اور اُس کے لشکروں کے مقابلے پر نکلے، تو انھوں نے دُعا کی: ''اے ہمارے ربّ! ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر''۔ آخرکار اللہ کے اذن سے اُنھوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اُسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا، اُس کو علم دیا ــــ اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا، لیکن دُنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)۔

قرآن سے تربیت و رہنمائی

ڈاکٹر محی الدین غازی

— قرآن مجید کتاب ایمان ہے، وہ دل کو ایمان و یقین سے منور کرتا ہے۔
— قرآن مجید کتاب عمل ہے، وہ زندگی کو بہترین عمل سے آراستہ کرتا ہے۔
— قرآن مجید کتاب حکمت ہے، وہ عقل کو آزادی اور توانائی عطا کرتا ہے۔
— قرآن مجید کتاب دعوت ہے، وہ بہترین داعی اور دردمند مربی بناتا ہے۔

یہ چاروں اوصاف انسانوں کی زندگی میں نظر آنے لگیں تو گویا زندگی میں قرآن مجید ظہور پذیر ہونے لگے، اور اگر یہی نظر نہیں آئے تو گویا قرآن مجید کا نہ دل پر نزول ہوا، نہ زندگی میں ظہور ہوا۔

بندگی کا جذبہ ایمان سے پیدا ہوتا ہے، اور ایمان کی قوت کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ قرآنِ مجید بتاتا ہے کہ کن چیزوں پر کیا ایمان لانا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ کس درجے کا ایمان لانا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ایمان والوں کی زندگی کیسی ہوتی ہے، اور وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ایمان کیسے بڑھتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی آیات کو سننے سے ایمان بڑھتا جاتا ہے، اور ایک کرن سے نُور کا ہالا بن جاتا ہے۔ قرآن مجید فلسفہ اور کلام کی غیر ضروری بحثوں سے بچاتے ہوئے، یقین کی بلند منزلوں کی سیر اور ایمان کی بلند چوٹیوں کو سر کراتا ہے۔ قرآن مجید وہ ایمان مانگتا ہے اور عطا کرتا ہے: جو غفلت کو قریب نہ پھٹکنے دے، جو بخل اور بزدلی سے آزاد کردے، جو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب اور اللہ کی مرضی کو سب سے زیادہ پسندیدہ بنادے، جو اللہ کے دین کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کے لیے بے قرار کردے۔ قرآن مجید اس ایمان کی تعلیم دیتا ہے جو انسان کے ظرف کو وسیع کرے، اس کے اندر خیر سے محبت اور برائی سے نفرت پیدا کرے،